# سورہ الحج کا بیان (حصہ اول)
## آیات ۱ تا ۲٤

سورہ الحج

قسط ۱

سورہ حج مکی سورت ہے. سورت کی متعدد اندرونی شہادتوں کی بنیاد پر یہ واضح ہوتا ہے کہ اس سورت کا نزول ۱۲ نبوی کے حج اور ربیع الاول ۱۳ نبوی/۱ ہجری کے درمیان کسی وقت ہوا ہے کہ جب مسلمانان مکہ نے مدینہ ہجرت کرنا شروع کر دی تھی تاہم نبی کریم ﷺ ابھی مکہ میں ہی مقیم تھے۔ اس سورت کو مکہ میں نازل ہونے والی آخری سورت مانا جا سکتا ہے کیونکہ ابتدائی مدنی سورت، سورہ بقرہ اور اس سورت کے مضامین میں خاصی مماثلت ہے۔ سورہ الحج میں مسلمانان مکہ کو نئی اسلامی ریاست میں پیش آمدہ معاملات کو بخوبی نبرد آزما ہونے کی ہدایات ہیں کیونکہ ان کو اب مشرکین مکہ کے برخلاف ایک ایسی قوم کا سامنا تھا جو کہ حامل شریعت بھی تھی یعنی کہ یہود، ساتھ ہی انکو جہاد کی اجازت بھی عنایت کی گئی تھی۔ دوسری جانب مکہ کے وہ مشرکین جنھوں نے نبیؐ کی دعوت کو نہ صرف مسترد کیا تھا بلکہ اس کی راہ میں روڑے اٹکائے ان کو ایک دنیاوی عذاب کا بتا دیا گیا جو کہ پھر غزوہ بدر کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اس سورت کا محور تین بنیادی نکات ہیں:

۱. ایمان بالقران

۲. ہجرت

۳. جہاد

قرآن کریم کی وہ سورتیں جن کے مضامین مروجہ شان نازول کی روایتوں کے باعث شدید انتشار کا شکار ہوئے ہیں ان میں سورہ حج سرفہرست ہے. مجاہد اور حضرت ابن عباسؓ سے منسوب قول یہ ہے کہ یہ سورت مکی ہے سوائے تین آیات کے -ھذان خصمان سے لے کر تین مکمل آیات تک، جبکہ ایک دوسری روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے ہی منسوب کیا جاتا ہے کہ یہ چار آیات ہیں عذاب حریق تک۔ ابن ضحاک اور حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی منسوب کیا جاتا ہے کہ یہ مدنی سورت ہے۔ جب کہ قتادہ کا قول ہے یہ مدنی ہے

سوائے چار آیات کے، ۵۲ سے ۵۵ تک آیات مکی ہیں۔ نقاش نے مدینہ طیبہ میں نازل ہونے والی آیات کو ۱۰ شمار کیا ہے۔

قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جمہور نے کہا کہ یہ ملی جلی سورت ہے جس میں بعض آیات مکی ہیں اور بعض مدنی۔ قرطبی کے مطابق یہ قول زیادہ صحیح ہے اس لیے کہ آیات اسی کا تقاضہ کرتی ہیں کیونکہ یا ایھا الناس مکی ہے اور یا ایھا الذین امنوا مدنی ہے۔ غزنوی نے کہا کہ یہ عجیب سورتوں میں سے ہے، یہ رات اور دن میں، سفر اور حضر میں، مکہ اور مدینہ میں، صلح اور جنگ میں نازل ہوئی، اس میں ناسخ بھی ہے اور منسوخ بھی، محکم آیات بھی ہیں اور متشابہ بھی، تعداد مختلف ہے۔

سید قطب کہتے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے اور مدنی بھی. اس کی بعض آیات کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ مدنی ہے خصوصاً ان آیات سے جس میں قتال کی اجازت دی گئی ہے (آیات ۳۸ تا ٤١) پھر اس آیت سے جن میں بدلہ لینے کی اجازت دی گئی ہے (آیت ٦٠)۔ ان آیات سے یہ قطعی طور پر مدنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ مسلمانوں کو جنگ اور قصاص کی اجازت صرف ہجرت کے بعد دی گئی تھی جب مدینہ میں ایک اسلامی مملکت قائم ہو گئی تھی۔ اس سے قبل ان باتوں کی اجازت نہ تھی۔

امین احسن اصلاحی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ سورت اپنے مزاج اور مطلب کے اعتبار سے مکی ہے۔ اس کی صرف چار آیات ۳۸ تا ٤١ مدنی ہیں جن میں مسلمانوں کو اجازت دی گئی ہے کہ اگر وہ حج کے لئے جائیں اور کفار اور قریش ان کو بزور روکنے کی کوشش کریں تو ان کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مدافعت میں تلوار اٹھا لیں۔ آگے مزید کہتے ہیں کہ انہی چند آیات کی بنا پر ہمارے مفسرین نے اس سورہ کے مکی یا مدنی ہونے کے باب میں اختلاف کیا ہے. لیکن کسی مکی سورت میں چند مدنی آیتیں داخل ہو جانے سے جب کہ ان آیات کی نوعیت بھی محض توضیحی آیات کی ہو پوری سورہ کو مدنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ آگے فرماتے ہیں صاحب کشاف نے بھی اس سورہ کو با اشتشنئ چند آیات مکی ہی قرار دیا ہے. دوسری جانب مولانا مودودی صاحب کی رائے ہے کہ ابتدائی ٢٤ آیات مکی اور باقی مدنی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر اس سورت کے دور نزول پر اتنے زیادہ اختلافات کیوں پیدا ہوئے۔ دراصل اس سورت کی متعدد آیات کے متعلق بعض گروہوں نے اپنے مذہبی اور سیاسی مقاصد کے لئے پہلی اور دوسری صدی میں ایسی ایسی روایات بیان کی ہیں کہ اس سورت کا اپنا نظم مکمل طور پر منہدم ہو گیا ہے۔ اگرچہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی سمیت

کئی جدید علماء نے روایات سے ماورا ہو کر بھی سورت کا ربط تلاش کرنے کی کوشش کی ہے تاہم پھر بھی وہ اس کا دور نزول مکمل طور پر متعین نہیں کر پائے ہیں۔

ان متضاد شان نازولوں نے سورت کے حقیقی مضامین کو گہنا کر جو نئے اور خطرناک مضامین اس سورت سے جوڑے ہیں وہ یہ ہیں.

١. شیطانی آیات کا مبینہ قرانی ثبوت

٢. خودکشی کا مبینہ قرانی جواز

٣. بنو ہاشم اور بنو امیہ کی خاندانی دشمنی کا مبینہ قرانی اشارہ.

اگرچہ ان تینوں باتوں کو ہی بہت سے علماء نے مختلف دلائل کی بنیاد پر رد کر دیا ہے لیکن ان تینوں نکات نے اور اس سورت سے متعلق بعض دوسری شان نازولوں نے سورت کے نظم کو جس طرح تہس نہس کیا ہے وہ پھر بحال نہ ہو سکا۔ اگر اس سورت کو اسی سورت سے فراہم کردہ شہادتوں کی بنیاد پر اس کے دور نزول میں جا کر پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت غالباً ایک ہی وقت میں نازل ہوئی ہے جو کہ اس دور کے گزشتہ عالمی اور مقامی حالات پر ایک تبصرہ اور پیش آئندہ واقعات پر رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

سورہ الحج کا ایک ہی وقت میں نازل ہونے کے بارے میں بعض اندرونی شہادتیں:

سورہ الحج کی تفہیم میں آسانی کے لیے اسکو چار تقاریر پر تقسیم کیا جاسکتا ہے لیکن ان تقاریر میں موجود بعض آیات کا دوسری تقاریر سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ یہ پوری سورت بیک وقت نازل ہوئی.

١- سورت کی پہلی تقریر (آیت ١ تا ٢٤) میں اس وقت کے عرب اور اس کے گردونواح کے حالات کی مناسبت سے مختلف گروہوں کی/کو مثالیں دے کر سمجھایا گیا ہے۔

٢- دوسری تقریر (آیت ٢٥ تا ٣٨) کا بنیادی محور مشرکین مکہ کا حج کے موقع پر غلط طرز عمل کی نشاندہی ہے۔

٣- تیسری تقریر (آیت ٣٨ - ٦٦) میں ہجرت کی شرط کے ساتھ مسلمانان مکہ کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے (٣٩-٤٠)

٤- چوتھی تقریر (آیت ٦٧ - ٧٨) میں مسلمانان مکہ کو بعد از ہجرت، ایک حامل شریعت امت (یہود) سے مکالمے کا بیان ہے

تیسری تقریر میں جب آیت ٤٠ میں جب مشیت الہی کا ذکر ہے تو پہلی تقریر میں بیان کردہ ایک گروہ کے اس وقت کے طرز عمل کا بالواسطہ حوالہ دیا جاتا ہے۔ دوسری تقریر (آیت ٢٥ تا ٣٨) کا اختتام جس آیت (آیت ٣٨) پر ہو رہا وہی آیت ٣٨ دراصل تیسری تقریر کا نقطۂ آغاز ہے۔ چوتھی تقریر (آیت ٦٧ - ٧٨) میں اگر ایک حامل شریعت امت (یہود) کے بعض شبہات کا بیان ہے تو وہیں یہود مدینہ کے اٹھائے گئے بعض سوالات کے جوابات سورت کی دوسری تقریر کی آیت ٣٦ میں بھی دے گئے ہیں۔ گویا سورت کے چاروں ذیلی مضامین ایک دوسرے میں باہم پیوست ہیں۔

## سورہ الحج کے مکہ میں نزول کی اندرونی شہادت:

سورہ الحج کی آخری آیات (آیت ٧٧ تا ٧٨) میں جن مسلمانوں سے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا کے صیغے سے خطاب ہوا ہے وہ درحقیقت مسلمانان مکہ ہی ہیں کیونکہ سورت کی آخری آیت ٧٨ میں ان کو اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر قائم ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ قریش اور مکہ کے گرد و نواح کے بعض قبائل، اولاد ابراہیمؑ تھے۔ جب کہ انصار مدینہؓ یمنی الاصل قحطانی قوم کی ذیلی شاخ تھے۔ سورت کی یہ اختتامی آیت جو کہ خاص مسلمانان مکہ کو خطاب کر رہی ہے یہ واضح کر دیتی ہے کہ اس سورت کا نزول مکہ المکرمہ میں ہوا تھا۔ آیت ٤٠ سے واضح ہوتا ہے کہ ہجرت کی ابتدا ہو چکی ہے اور آیت ٧٢ سے اشارہ ملتا ہے کہ رسول پاک ﷺ نے ابھی مدینہ منورہ ہجرت نہیں کی ہے۔ مشرکین مکہ کے حج کے موقع پر غلط طرز عمل کی سرزنش وضاحت کرتی ہے کہ ١٢ نبوی میں ہونے والا حج مکمل ہو چکا ہے۔ لہذا رسول اللہ ﷺ کی مکہ میں موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کا نزول ١٣ نبوی/ ١ ہجری میں محرم سے ربیع الاول کے درمیان مکہ المکرمہ میں کسی وقت ہوا ہے۔

قسط ٢

## آیت ١ اور ٢کا بیان:

سورہ حج کی یہ تقریر چوبیس آیات پر مشتمل ہے۔ سورت کا آغاز ہی لوگوں اور خاص طور پر اولین مخاطبین یعنی مشرکین مکہ کو قیامت کی ہولناکی سے آگاہ کر کے کیا جارہا ہے، کیونکہ انکا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا جیسے قائم ہے ویسے ہی جاری و ساری رہے

گی، نہ تو کبھی یہ ختم ہوگی اور نہ ہی کبھی دوسری زندگی کا سلسلہ شروع ہوگا۔ آیت ۱ اور ۲میں ارشاد ہوتا ہے:

لوگو، اپنے رب کے غضب سے بچو، بیشک ناگوار گھڑی (الساعۃ) کا بھونچال بڑی (ہولناک) چیز ہے (۱) جس روز تم اسے دیکھو گے، حال یہ ہو گا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے سے غافل ہو جائے گی، ہر پیٹ والی اپنا پیٹ ڈال دیگی، اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے، حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہوگا (۲)

آیت اپنے بیان میں بالکل واضح ہے کہ یہ اس دن کی منظر کشی کی جارہی ہے کہ جس دن اس دار العمل دنیا کی بساط لپیٹی جارہی ہوگی۔ ہولناکی کی شدت بیان کرنے کے لیے دنیاوی رشتوں میں سچا اور خالص ترین رشتہ یعنی کہ ماں کا احوال بیان کیا جارہا ہے کہ وہ بھی اپنے بچوں سے غافل ہوجائے گی۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے تفسیر ماجدی میں ماہرین عربیت صاحب کشافؒ اور صاحب کبیرؒ کے حوالے سے آیت میں وارد لفظ مرضعۃ کی بابت فرمایا ہے کہ "یہاں دودھ پلانے والی کی عام حالت کا بیان نہیں کہ رضاعت کرنے والی مائیں اپنے شیرخوار بچوں کو بھول جائیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جو ماں عین اس وقت دودھ پلارہی ہوگی اور بچہ اسکی چھاتیوں کو اپنے منہ میں لیا ہوگا، وہ بھی مارے ہول کے اس وقت اپنے بچہ کو چھوڑ بھاگے گی۔ یعنی مرضعۃ بالفعل و فی الضال نہ کہ محض بالقوہ۔"

دوسری جانب جامع ترمذی کی کتاب التفسیر میں خواجہ حسن بصری کی دو روایات درج ہیں، جن کے مطابق صحابی رسول حضرت عمرانؓ بن حصین نے فرمایا کہ:

" جب آیت «یا أیھا الناس اتقوا ربکم إن زلزلة الساعة شيء عظیم» سے قول «ولکن عذاب اللہ شدید» تک نازل ہوئی (درج بالا دونوں آیات) تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت سفر میں تھے، آپ نے لوگوں سے فرمایا: ”کیا تم جانتے ہو وہ کون سا دن ہے؟“ لوگوں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ آپ نے فرمایا: ”یہ وہ دن ہے جس دن اللہ آدم ( علیہ السلام ) سے کہے گا ”جہنم میں جانے والی جماعت کو چھانٹ کر بھیجو"---------(روایت خاصی طویل ہے)" (جامع ترمذی، کتاب التفسیر)

اس کے بعد امام ترمذیؒ کہتے ہیں: ۱- یہ حدیث حسن صحیح ہے، ۲- یہ حدیث کئی راویوں سے حسن (بصری) بذریعہ عمرانؓ بن حصین کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ حسن بصری نے ان آیات میں بیان کردہ بھونچال کو دنیا کی بساط لپیٹے جانے کے دن کی بجائے روز حشر سے متصف کردیا ہے، جس کی وجہ سے تفہیم میں سب سے بڑی مشکل تو یہ آئی کہ کیا میدان حشر میں حاملہ عورتیں اپنے حمل کے ساتھ

اٹھیں گی، یا دودھ پلانے والی جب اٹھے گی تو چھاتیوں کو اپنے شیر خوار کے منہ میں دیے ہوئے اٹھے گی۔ دوسری چیز یہ کہ حسن بصری نے یہ روایت سننے کا دعوی جس صحابی یعنی حضرت عمرانؓ بن حصین سے کیا ہے، وہ تو ۷ ہجری میں ایمان لائے ہیں، یعنی اگر حسن بصری کے بیان کو درست مانا جائے تو اس سورت کا نزول مکہ تو کجا مدینہ کے بھی بالکل آخری دور مین ماننا پڑیگا کیونکہ حضرت عمرانؓ بن حصین تو خیبر کے زمانے میں ایمان لائے ہیں۔ جو سورت ہجرت کے بعد جہاد کی اجازت دے رہی ہو، جو سورت یہود سے مکالمہ کر رہی ہو، اسکی پہلی دو آیات کیا تب نازل ہوں گی جبکہ یہودیوں سے آخری جنگ (غزوہ خیبر) بھی ہوگئی ہو۔ یہ کیونکر ممکن ہے۔ باقی جزا و سزا کے دن عورتوں کا حاملہ ہونا اور دودھ پلانا چہ معنی دارد۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ تفسیر البیان میں ارشاد فرماتے ہیں 'روایات سے عین قیامت کے روز اور قیامت سے پہلے بھی زلزلہ کا وقوع ثابت ہے لیکن جس زلزلہ کا آیت میں ذکر ہے حدیث سے اس کا وقوع قیامت کے روز معلوم ہوتا ہے' (حسن بصری کی یہی روایت) آگے فرماتے ہیں 'تذھل کل مرضعۃ کے ظاہر الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز بھی عورتیں بچوں کو دودھ پلائیں گی سو یا تو یہ التزام کرلیا جاوے اور کہا جاوے کہ جو جس حالت میں مرا ہے اسی حالت میں محشور ہوگا (یعنی کہ اٹھایا جائے گا)سو ممکن ہے کہ جو عورتیں حالت ارضاع میں مری ہیں انکی وہاں بھی یہی حالت ہو اور یا کلام کو مبنی تمثیل پر کہا جاوے'

مولانا تھانویؒ نے اس روایت کو آیت کے مطابق کرنے کے لیے یا آیت کو روایت کے مطابق کرنے کے لیے یہ تو فرمادیا کہ یہ مان لیا جائے کہ جو جس حالت میں مرا ہے وہ اسی حالت میں اٹھے گا، لیکن سوال یہ ہے کہ کتنی دودھ پلانے والی عورتیں ہیں، جو اس حالت میں مرتی ہیں کہ انکی چھاتیاں انکے بچوں کے منہ میں ہوں اور موت آجائے؛ اور بالفرض ایسا ہو بھی جائے، تو یہ بھی تو لازم ٹھہرنا چاہیے کہ وہ بچہ بھی اسی لمحے مرے، ورنہ اگر وہ بالغ ہوگیا، تو اسکا تو بروز حشر اپنا حساب کتاب ہونا ہوگا ، وہ اس دن اپنی ماں کے ساتھ چمٹا ہوا کیوں اٹھے گا ۔ تیسری چیز یہ کہ ماں بچہ اگر بالفرض عین دودھ پلوانے کے دوران ہی بیک وقت فوت ہوئے ہوں، تو بھی لواحقین انکو ایک قبر میں تو دفن نہ کریں گے۔ رضاعت کی حالت میں اٹھنے کے لیے ساتھ دفن ہونا بھی تو ضروری ٹھہرتا ہے۔ گویا ایک ایسی مثال جسکے ہونے کے امکانات معدوم کی حد تک ہوں، اسکو عبرت کے طور پر اللہ تعالی کس واسطہ بیان کرے گا؛ مزید یہ کہ صحیح بخاری مسلم نسائی اور خود ترمذی میں سعید بن جبیر کے حوالے سے یہ روایت بھی موجود ہے کہ لوگ روز حشرغیر

مختون اٹھیں گے۔ غیر مختون والی روایت سے یہ تو ثابت ہوا کہ دونوں روایات بیک وقت تو درست نہیں ہو سکتیں، کیونکہ تقریباً تمام مسلمان مرد مرتے وقت ختنہ شدہ ہوتے ہیں- آگے جب مولانا تھانویؒ نے جب دوسرا امکان مبنی بر تمثیل بیان کردیا، تو اس سے خود واضح ہوجاتا ہے کہ حسن بصری کی اس روایت کو قبول کرنے میں انکو کس درجہ دشواری پیش آرہی ہے۔

اب یہ دیکھتے ہیں کہ سورہ حج خود اس ناگوار گھڑی کے متعلق مزید کیا اشارے دے رہی ہے۔ آیا ان آیات میں میدان حشر کی کیفیت بیان ہوئی ہے یا قیامت سے بالکل پہلے کا بیان۔ قران میں الساعۃ کسی موعود یا ناگوار گھڑی کے لیے بیان ہوا ہے، اس کا لازمی مطلب روز حشریا قیامت سے بالکل پہلے کا بھونچال نہیں ہے۔ آیات کا سیاق و سباق واضح کرتا ہے کہ یہاں کس ناگوار گھڑی کی بات ہورہی ہے۔ سورہ حج میں کل ۳ مرتبہ الساعۃ کا لفظ آیا ہے؛ جس مین پہلا تو یہی ہے کہ جس کا ظاہری معنی قیامت سے بالکل پہلے کا زلزلہ بنتا ہے، اور حسن بصری کے مطابق یہاں میدان حشر کا تذکرہ ہے۔ اسی سورت میں موجود دیگر الساعۃ سے بات مزید واضح ہوجائے گی کہ یہاں کس کا تذکرہ ہورہا ہے۔ آیت ۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ (۷)

اور الساعۃ آ کر رہے گی، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، اور اللہ ضرور اُن لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں (۷)

اس آیت میں الساعۃ سے مراد دراصل آیت ۱ اور ۲ میں بتائے گئے احوال کے لازم آنے کا اعادہ ہے اور اس کے بعد 'اور' کہہ کر قبروں میں موجود لوگوں کے اٹھائے جانے کے ذکر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ روز حشر کا ذکر اس سورت میں بتائے گئے الساعۃ کے بعد کا موقع ہے۔ گویا اس سورت میں بیان کیا گیا الساعۃ قیامت سے بالکل پہلے کی کیفیت کا بیان ہے۔

دوسری جانب آیت ۵۵ میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مِرْيَةٍ مِنْهُ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً أَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ (۵۵)

انکار کرنے والے تو اس کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہیں گے یہاں تک کہ یا تو اُن پر الساعۃ اچانک آ جائے، یا ایک بانجھ دن کا عذاب نازل ہو جائے (۵۵)

یہاں مشرکین مکہ کا ذکر ہورہا ہے، اور بانجھ دن سے مراد یوم بدر ہے، جو کہ ایک دنیاوی عذاب ہے۔ جو بھی شخص یوم بدر میں عذاب سے دوچار ہوا، اسکو روز حشر کا سامنا تو

کرنا ہی پڑیگا، جبکہ یہاں الساعۃ کا لفظ 'اَوْ' کے ساتھ آیا ہے جسکے معنی 'یا' کے ہوتے ہین، یعنی مشرکین مکہ پر الساعۃ یا میدان بدر کی ذلت میں سے ایک کیفیت آئے گی۔ جبکہ حساب کتاب کی دن کی سختی تو مقتولین بدرنے بھی دیکھنی ہے، لہذا الساعۃ اور بانجھ دن میں سے ایک سے ثابت ہوا کہ یہاں بھی الساعۃ سے مراد میدان حشر کی سختی نہیں ہوسکتی۔ گویا یہ الساعۃ جو کہ سورت کی پہلی آیت کی توضیح کر رہا ہے یہی ثابت کرتا ہے کہ اس سورت میں جس الساعۃ کا ذکر ہوا ہے، وہ قیامت سے بالکل پہلے کا بھونچال ہے۔

جو لوگ اس نظریہ کے قائل ہیں کہ اگر شان نزول کی روایات نہ ہوتیں تو قران کی تفہیم ناممکن ہوجاتی، وہ صرف ان آیات کے حوالے سے حضرت تھانویؒ کے درج بالا اقتباسات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان روایات نے آسانی نہیں بلکہ تفہیم میں دشواری پیدا کی ہے۔ وہ مفسرین کرام جو سورہ حج کو مکی مانتے ہیں، یا کم از کم ابتدائی حصے کو مکہ میں نازل شدہ مانتے ہیں، انہوں نے تو حسن بصری کی اس روایت کا عملی طور پر انکار کر ہی دیا ہے لیکن بہت سے ایسے لوگ جو اس الساعۃ کو قیامت سے پہلے کی کیفیت بھی مانتے ہیں،اور پھر بھی حسن بصری کی اس روایت اور بعض دیگر روایات کے اثر میں اس سورت کو مدنی مان لیتے ہیں۔ اور یہیں سے اس سورت کے مضامین کی تفہیم میں دشواری پیدا ہوتی ہے اور سورت کا نظم متاثر ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ اور آیات کا مفہوم آیات کے ربط کی بجائے شان نزولون کا مزید محتاج ہوجاتا ہے۔ اگر قران کی تفسیر میں سب سے پہلے قران کو ہی مد نظر رکھا جائے تو یہ دشواری کبھی پیدا نہ ہو، اور بہت سے لوگوں کی حقیقت بھی واضح ہوجائے۔ قران کریم کا یہ بہت بڑا اعجاز ہے کہ ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کردیتی ہے، اگر کوئی شان نزول کسی آیت کے بیان کا تعین بدلنے کی کوشش کریگی، تو کوئی دوسری آیت ضرور اسکا انکار کردیگی۔

قسط ۳

دنیا کی بساط لپیٹے جانے کے ذکر کے فوراً بعد دنیا کے تین قسم کے گروہوں کا بیان ہوا ہے، جو کہ حق پر نہیں ہیں

۱. جن کے پاس کوئی علم (کتاب) نہیں ہے۔ (آیت ۳)

۲. جن کے پاس کتاب تو ہے لیکن وہ ہدایت کی طرف رہنمائی نہیں کر رہی۔ (آیت ۸)

٣. جن کے پاس اللّٰہ کے احکامات تو ہیں گویا کتاب تو موجود ہے لیکن وہ نیم دلی سے عمل پیرا ہیں۔ (آیت ١١)

آیت ٣ تا ٧ کا بیان:

"بعض لوگ ایسے ہیں جو عِلم کے بغیر اللہ کے بارے میں بحثیں کرتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کی پیروی کرنے لگتے ہیں (٣) حالانکہ اُس کے تو نصیب ہی میں یہ لکھا ہے کہ جو اس کو دوست بنائے گا اسے وہ گمراہ کر کے چھوڑے گا اور عذاب جہنّم کا راستہ دکھائے گا (٤) لوگو، اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کر دیں ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچّے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی پُوری جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اُس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی (۵) یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے، اور وہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، (٦) اور یہ (اِس بات کی دلیل ہے) کہ الساعۃ (دنیا کے خاتمہ کی گھڑی) آ کر رہے گی، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، اور اللہ ضرور اُن لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں(٧)"

پہلے گروہ کا ذکر آیت ٣ سے شروع ہو رہا ہے جو کہ آیت ٧ تک جاری رہا ہے۔ مشرکین مکہ بحیثیت مجموعی اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے پاس کوئی روشن یا غیر روشن کتاب تو کجا، کوئی کتاب سرے سے ہی موجود نہیں تھی، یعنی مکمل طور پر اُمی تھے۔ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے دور کی بعض سنتیں تو اگرچہ ان کے یہاں کسی نہ کسی صورت میں چلی آرہی تھیں، تاہم عقائد کے سلسلے میں مکمل طور پر انحراف آچکا تھا، جن میں سے ایک بعد از موت دوبارہ زندہ کیا جانے کا انکار بھی تھا. آیت ٥ سے ٧ تک عقلی دلائل کے ذریعہ مشرکین مکہ کو عقیدہ آخرت اور دوبارہ زندہ کیے جانے پر توجہ دلائی گئی ہے۔

غور و خوض کے لیے پہلی مثال انسان کی پیدائش اور موت کے حوالے سے پیش کی گئی ہے، کہ اگر تم لوگ سمجھ رہے ہو کہ دنیا جیسے جاری وساری ہے ایسے ہی ہمیشہ برقرار

رہے گی، تو زرا جنین پر غور کرو کہ اگر سب کچھ بس ایک ہی طریقہ پر جاری رہتا تو تمہارے اپنے مشاہدے میں ہے کہ بعض جنین تو صحتمند طریقہ سے نشونما پاتے ہیں، جبکہ بعض اس قاعدے سے انحراف کرتے ہیں، اسی طرح انسانی موت ہے، لوگوں کی اکثریت اگر طبعی عمر پوری کرتی ہے، تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو بھری جوانی میں مرجاتا ہے، جبکہ کوئی طبعی عمر بھی پار کرجاتا ہے۔ انسانی زندگی کے حوالے سے یہ دونوں مثالیں کیا یہ ثابت نہیں کرتیں کہ ہر چیز انسانی فہم کے دستور کی پابند نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر یہ دنیا تمہیں صدیوں سے جاری و ساری نظر آرہی ہے، تو اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ تمہاری تفہیم کے مطابق ہمیشہ جاری رہے گی۔ جیسے انسانی زندگیاں طبعی عمر سے آگے پیچھے ہوتی تمہیں اپنی نگاہوں سے نظر آرہی ہیں، اسی طرح یہ دنیا بھی ایسے ہی نہیں چلتی رہے گی بلکہ کسی وقت لپیٹ دی جائے گی۔

دوسری مثال انسانوں کے دوبارہ جی اٹھنے یعنی روز حشر کے حوالے سے مردہ زمین کے زندہ ہونے کی دی گئی ہے کہ تم لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ کوئی زمین عرصہ دراز سے بنجر پڑی ہوتی ہے، جس میں زندگی کے آثار مفقود ہوچکے ہوتے ہیں مگر جونہی ادھر بارش ہوتی ہے، ادھر اس میں دوبارہ زندگی کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں۔ جب زمین کا مردہ اور زندہ ہوجانا تمہارے مشاہدے میں ہے، تو یہ ماننے میں کیوں تردد ہو رہا ہے کہ اللہ انسانوں کو بھی دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے- یہ مثال میدان حشر کے حوالے سے دی گئی ہے-

دراصل رسول اللہ کی دعوت کو جھٹلانے کی سب سے بڑی وجہ ہی یہ تھی کہ مشرکین مکہ یہ بات ماننا ہی نہیں چاہ رہے تھے کہ وہ خدا کے آگے بھی مسئول ہونگے، لہذا دارالعمل کا خاتمہ اور دوبارہ جی اٹھنے کے بعد دارالجزا کا عقیدہ ان کے ماننے کے لے سب سے دشوار تھا۔

آیت ۸ تا ۱۰ کا بیان:

"بعض اور لوگ ایسے ہیں جو کسی علم اور ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب کے بغیر، گردن اکڑائے ہوئے (۸) خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہِ خدا سے بھٹکا دیں ایسے شخص کے لیے دُنیا میں رُسوائی ہے اور قیامت کے روز اُس کو ہم آگ کے عذاب کا مزا چکھائیں گے (۹) یہ ہے تیرا وہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لیے تیار کیا ہے ورنہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے (۱۰)"

دوسرے گروہ کی تفہیم سے پہلے ایک پہلو پر نظر رکھنا بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ سورہ حج کی یہ تقریر (آیت ۱ تا ٢٤) قرآن کریم کا وہ واحد مقام ہے جہاں مجوس کا لفظ

آیت ١٧ میں استعمال ہوا ہے. مکہ المکرمہ کی آبادی مشرکین پر مشتمل تھی جن کا ذکر بحثیت مجموعی پہلے گروہ کے طور پر ہو چکا ہے. مکہ المکرمہ کے مضافات میں مسیحی میں آباد تھے، دوسری جانب مدینہ منورہ میں یہودیوں کی ایک بہت بڑی تعداد آباد تھی۔ مجوسیوں کا حجاز کی مقامی مذہبی تقسیم میں کوئی نمایاں حصہ نہ تھا. بالکل اسی طرح ایک اور مذہبی گروہ صابی کا ذکر بھی قرآن میں سب سے پہلی مرتبہ سورہ حج کی آیت ١٧ میں ہی استعمال ہوا ہے. اگرچہ سورہ حج کے بعد نازل ہونے والی سورتوں، سورہ بقرہ اور مائدہ میں دیگر اہل کتاب گروہوں کے ساتھ بھی ان کا ذکر آیا ہے لیکن یہ گروہ بھی حجاز کے اندر قابل ذکر تعداد میں موجود نہیں تھا.

اگر سورت کی اس تقریر (آیات ١ تا ٢٤) میں دو غیر مقامی مذہبی گروہوں کا ذکر کیا جا رہا ہے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں لوگوں کی جو مختلف نظریاتی تقسیم بیان کی گئی ہے وہ مقامی تناظر میں نہیں بلکہ عالمی تناظر میں کی گئی ہے. آیت نمبر ٨ اور ٩ میں جن لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے اور پھر ان کے انجام سے آگاہ بھی کیا جا رہا ہے وہ دراصل وہ لوگ ہیں جو بنا کسی علم اور کسی روشن (الہامی) کتاب کے خلق خدا کو گمراہ کر رہے تھے۔ اس گروہ کو سمجھنے کے لئے اس زمانے کی عالمی سیاست کو سمجھنا ہو گا. عرب کے عین شمال میں دو بڑی طاقتیں موجود تھیں. ایک جانب بازنطینی (رومی) عیسائی تھے تو دوسری جانب ساسانی (ایرانی) مجوسی تھے. مجوسی مذہب کے پاس بھی ایک کتاب موجود ہے جس کو اوستا کہتے ہیں. قرآن کریم نے اس کتاب کے لئے روشن (مبین) ہونے کا ذکر نہیں کیا، جبکہ تورات اور انجیل کے لئے کیا ہے.

ساسانی بادشاہ خسرو پرویز کی سلطنت دراصل رومی بادشاہ موریس کی مرہوں منت تھی. موریس کی بدولت ایران کی خراسانی فوجی بغاوت کو کچلا گیا تھا اور خسرو پرویز کو استحکام ملا تھا. اسی واسطے خسرو پرویز موریس کو اپنا باپ کہا کرتا تھا. رومی سلطنت میں عیسائی اقلیتی فرقوں نسطوری اور یعقوبی وغیرہ کے لئے زمین تنگ تھی. اور ان کی بڑی آبادی ساسانی سلطنت کے مغربی صوبوں میں آباد تھی. خسرو پرویز کی بااثر ترین بیوی شیریں بھی ایسی ہی ایک عیسایٔ تھی. جبکہ اس نے موریس کی عیسائی بیٹی سے بھی شادی کرلی تھی. ایران کے مجوسیوں میں خسرو پرویز کے اس عمل کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا رہا تھا. موریس جب بلقان کے مغربی محاذ پر سلاوی قبائل سے نبرد آزما تھا تو اس کی فوج کے ایک کمانڈر فوکاس نے اس کو اور اس کے پانچ بیٹوں کو قتل کر کے بازنطینی سلطنت پر قبضہ کر لیا. خسرو پرویز کو یہ بہترین موقع ملا کہ وہ ساسانی سلطنت کو وسعت دے. اور اس نے موریس (اپنے منہ

بولے باپ) کے قتل کا بدلہ لینے کے بہانے بازنطینی سلطنت پر حملہ کر دیا اور پے در پے بازنطینیوں کو شکستیں دیتا گیا۔ دوسری جانب فوکاس نہ تو سلطنت میں اندرونی استحکام لا پایا اور نہ ہی اس ساسانی بیرونی جارحیت کا مقابلہ کر سکا. نتیجتاً ہرقل نے اقتدار پر قبضہ کیا اور خسرو پرویز کو جنگ ختم کرنے کا کہا کیونکہ اب اس کے منہ بولے باپ کا قاتل فوکاس مارا جا چکا تھا. یہی وہ زمانہ تھا جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں نبوت کا اعلان کیا تھا۔

نبوت کے اعلان کے ساتھ ہی مکہ میں رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں کی شدید مخالفت شروع ہو چکی تھی. قرآن کا تدریجاً نزول جاری تھا اور ہر سورت کے نزول کے ساتھ ساتھ جہاں مخالفت کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا وہاں مسلمانوں کی تعداد بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی. اور پھر جب سورہ مومنون نازل ہوئی تو پہلی بار حضرت عیسیٰؑ کا ذکر، حضرت مریمؑ کے بیٹے کے طور پر اچھے الفاظ میں کیا گیا. اور یہاں سے مشرکین کی زبان حضرت عیسیٰ کے خلاف بھی کھلی جس کا ذکر حضرت عیسیٰ کے حوالے سے اگلی نازل ہونے والی سورت زخرف میں بیان ہوا ہے. تناؤ کے اس ماحول میں مشرکین کی پوری ہمدردیاں ساسانی رومی جنگ میں ساسانیوں کے ساتھ ہو گئیں اور وہاں صورت حال یہ تھی کہ رومیوں کو پے در پے شکست ہو رہی تھی. پانچ نبوی کے اس پاس عیسائیوں کے مقدس ترین شہر یروشلم پر بھی ساسانی قبضہ ہو گیا. شہر کو خون سے نہلا دیا گیا، کنیسہ قیامہ کو تباہ کر دیا گیا. مقدس صلیب کو ساسانی سلطنت میں پہنچا دیا گیا.

یہ وہ موقع ہے جب مشرکین مکہ مسلمانوں کا اس حوالے سے تمسخر اڑا رہے تھے کہ جب عیسائی دنیا کا مقدس ترین شہر خسرو پرویز کے ہاتھوں تاراج ہوا. اس کے بعد سورہ روم کا نزول ہوا جس میں بیان کیا گیا کہ عنقریب رومی (ساسانیوں/مجوسیوں پر) غالب آ جائیں گے. عالمی سیاست کے حوالے سے یہ پہلی سورت تھی تاہم اس میں مجوس کا لفظ استعمال نہیں ہوا تھا گویا ان کا ذکر انکا نام لئے بغیر ہی کر دیا گیا. یروشلم کی شکست کے تھوڑے عرصے بعد وہ حالات ائے جب ہرقل نے صلح کی پیشکش کی تو خسرو پرویز نے غرور کے پندار میں لپٹا ہوا جواب بھیجا جس کا آغاز اس طرح سے تھا

"سب خداؤں سے بڑے خدا، تمام روئے زمین کے مالک، خسرو کی طرف سے اس کے کمینے ہرقل کے نام ... تو کہتا ہے تجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے کیوں نہ تیرے رب نے قیصریہ، یروشلم اور اسکندریہ کو بچایا. ..."

اس کے بعد اس نے عیسائیوں کے بعض اعتقادات کی تضحیک بھی کی اور ہرقل کو عیسائیت سے تائب ہوکر اپنے زیر فرمان ہونے کا حکم دیا۔ گویا اب تک کی اپنی پالیسی کے برخلاف وہ اس جنگ کو مجوسیت اور عیسائیت کی جنگ کے رنگ میں بدل رہا تھا. خط کے الفاظ سے ہی اس کا غرور تکبر بہت واضح ہے. سورت کے نظم کے مطابق دیکھا جائے تو آیت ۸ میں خسرو پرویز اور اس کے حواریوں کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے. جن کے پاس نہ تو کوئی روشن کتاب تھی مگر پھر بھی گردن اکڑائے ہوئے لوگوں کو مزید گمراہی کی طرف دھکیل رہے ہیں. آگے بتایا گیا کہ ان لوگوں کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں تو عذاب کا مزہ چکھنا ہی ہے.

۷ ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد جب رسول اللہ نے عالمی لیڈروں کو اسلام کی دعوت دی تو خسرو پرویز کو بھی حضرت عبداللہؓ بن حذافہ سامی کے ذریعہ خط بھیجا گیا جس کو اس نے تکبر میں آکر پھاڑ کر پھینک دیا اور خسرو کا انجام یہ ہوا کہ اس وقوعے کے کچھ ہی دن بعد اپنے ہی سگے بیٹے قباد کے ہاتھوں مارا گیا. قباد نے اپنے باپ کی پالیسیوں کے برخلاف رومی عیسائیوں کا اکرام کیا اور انکی مقدس صلیب ان کے حوالے کردی۔

قسط ٤

آیت ١١ تا ١٤ کا بیان:

"اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے، اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی آزمائش آگئی تو الٹا پھر گیا اُس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی؛ یہ ہے صریح خسارہ (١١) پھر وہ اللہ کو چھوڑ کر اُن چیزوں کو پکارتا ہے جو نہ اُس کو نقصان پہنچا سکتی ہیں نہ فائدہ؛ یہ ہے گمراہی کی انتہا (١٢) وہ اُن لوگوں کو پکارتا ہے جن کا نقصان اُن کے نفع سے قریب تر ہے؛ بدترین ہے اُس کا مولیٰ اور بدترین ہے اُس کا رفیق (١٣) بیشک اللہ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے (اس کتاب پر) اور جنہوں نے نیک عمل کیے، یقیناً ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اللہ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے (١٤)"

آیت ١١ سے تیسرے گروہ کے ذکر کا آغاز ہو رہا ہے جو کہ نیم دلی سے اللہ کی عبادت کر رہے تھے اور اس کا اختتام آیت ١٦ پر ہو رہا ہے. اس کے فوراً بعد آیت ١٧ میں ایمان لانے والوں اور مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان قیامت کے روز فیصلہ کر دینے کی بات کی

گئی ہے۔ آیت ١٧ میں مشرکین اور مجوس کے علاوہ اہل کتاب کے مذہبی گروہوں کا ذکر ہے، گویا سورہ الحج کی اس تقریر کا نظم خود واضح کر دیتا ہے کہ یہاں کنارے پر رہ کر اللّٰہ کی عبادت کرنے والوں سے مراد دراصل اہل کتاب ہی ہیں. ترتیب میں بھی یہی بات درست لگتی ہے، کہ آیت ٣ میں بیان کردہ پہلا گروہ وہ ہے کہ جس کے پاس کوئی علم نہیں ہے، جبکہ آیت ٨ میں بیان کردہ دوسرے گروہ کے لیے اس میں مزید اضافہ ہے کہ انکے پاس روشن کتاب نہیں ہے۔ اب جب تیسرا گروہ بیان ہورہا ہے، جو بہرحال اللہ کی عبادت بھی کر رہا ہے مگر اپنی خواہشات کے تابع رکھ کر، تو وہ وہی گروہ بنتا ہے کہ جسکے پاس اس وقت روشن کتاب بھی موجود ہو، کہ جو حق کی جانب گامزن تو کر رہی ہو لیکن اسکی پیروی کرنے کے دعویدار حق کی جانب گامزن ہونا نہ چاہ رہے ہوں۔

قرآن کریم کی دعوت کی ابتداء اگرچہ مکہ کے باشندوں کو لیکر شروع ہوئی تھی تاہم بعد میں دعوت کا دائرہ بتدریج بڑھا. یہاں تک کہ مکہ میں ہی جب سورہ الاعراف نازل ہوئی تو آیت ١٥٧-١٥٨ میں واضح طور پر اہل کتاب کو نبی اُمی حضرت محمّدؐ پر ایمان لانے کا کہہ دیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے

"(اہل کتاب میں سے) جو اِس پیغمبر، نبی اُمی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر اُنہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے.... وہی فلاح پانے والے ہیں (١٥٧) اے محمدؐ، کہو کہ اے انسانو، میں تم سب (اُمی اور کتابی) لوگوں کی طرف اُس خدا کا پیغمبر ہوں ... پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے، اور پیروی اختیار کرو اُس کی، امید ہے کہ تم راہ راست پا لو گے" (١٥٨) سورہ الاعراف

اہل کتاب اللّٰہ کو تو مانتے تھے اور ان میں یہود عمومی طور پر موحد ہی تھے۔ ان یہودیوں کی ایک بڑی آبادی مدینہ میں آباد تھی اور وہ کسی حد تک تورات پر عمل پیرا بھی تھی۔ شروع سے ہی یہ قوم اس زعم میں مبتلا تھی کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد ہونے کے ناطے وہ اللّٰہ کے چنیدہ اور محبوب ترین بندے ہیں. مشرکین مکہ بھی اولاد ابراہیمؑ ہی تھے۔ وہ اور عرب کے کئی دیگر قبائل اپنے تئیں دین ابراہیمیؑ پر عمل پیرا بھی تھے تاہم وہ لوگ شرک جلی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ لہذا ایک ہی سرزمین پر رہتے ہوئے اور ایک ہی نبی حضرت ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے کے باوجود بھی یہودیوں اور مشرکین کے مذاہب میں زمین و آسمان کا فرق آ چکا تھا اور سرزمین عرب میں یہود تفاخر پر مبنی اپنی مذہبی انفرادیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہے تھے. لیکن حضرت محمّد ﷺ کی بعثت کی صورت میں اولاد ابراہیمؑ کی غیر اسرائیلیؑ

(اسماعیلیؑ) شاخ میں ایک نبی کا ظہور ہو گیا تھا جو یہودیوں سمیت تمام عالم کو دعوتِ حق دے رہا تھا جس کو قبول کرنے میں یہود کو انتہائی تردد ہو رہا تھا. نسلی تفاخر کی عینک سے دیکھ کر حق کی دعوت کو قبول و رد کرنے والے ان یہود کی اس عادت کا ذکر سورہ بقرہ کی آیت ۹۱ میں ان الفاظ میں آتا ہے:

"جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ، تو وہ کہتے ہیں "ہم تو صرف اُس چیز پر ایمان لاتے ہیں، جو ہمارے ہاں (یعنی نسل اسرائیل) میں اتری ہے" اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے، اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ حق ہے اور اُس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی .. "(۹۱) سورہ البقرہ

جیسا کہ ابتداء میں بیان کر دیا گیا ہے کہ سورہ الحج کا نزول اس وقت نازل ہوا جب مسلمانان مکہ کی طرف سے مدینہ ہجرت شروع ہو چکی تھی تاہم نبی پاک ﷺ ابھی مکہ میں ہی مقیم تھے. جب تک رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا مرکز مکہ رہا، یہودیوں کے لئے پھر بھی عدم اطمینان کی بات نہیں تھی لیکن اب جب دعوت حق ان ہی کے دروازوں پر دستک دینا شروع ہو چکی تھی تو یہ ان کے لئے ایک آزمائش بنتی جا رہی تھی کہ ایک غیر اسرائیلی نبی کی دعوت کیونکر قبول کریں باوجود اس کے کہ وہ جان چکے تھے کہ یہ دعوت حق ہے.

آیت ۱۱ میں وضاحت کر دی ہے کہ کہ ایک غیر اسرائیلی نبی کو قبول کرنا اگرچہ ان کے لئے ایک آزمائش ضرور ہے، لیکن اگر اس کو قبول نہ کیا تو دنیا اور آخرت دونوں کا ہی خسارہ ہاتھ لگے گا. اور آیت ۱۲ میں ارشاد ہوتا ہے کہ جب حق سے گریز اختیار کیا جاتا ہے تو انسان گمراہی میں مبتلا ہو کر اس حد تک گر جاتا ہے کہ ایسی چیزوں کو پوجنے لگتا ہے جو نفع اور نقصان دونوں ہی کا اختیار نہیں رکھتیں. بنی اسرائیل میں یہ گمراہی تاریخ کے کئی مواقع پر آئی ہے جب بت پرستی بھی قوم کے بعض حصوں میں در آئی. خود قرآن نے اس کی مثال دی کہ جب حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو نیم دلی سے قبول کیا گیا تھا تو وہ موقع بھی آیا تھا کہ جب سامری نے بچھڑا بنا کر دیا اور انھی کی قوم کے لوگوں نے اس کی پرستش بھی شروع کر دی۔ گمراہی کی دوسری قسم آیت ۱۳ میں بیان کی گئی کہ حق پہنچاننے کے باوجود بھی تاویلیں کر کے اس کو مسترد کرنے کے لئے لوگ پھر ایسے لوگوں کی پیروی کرتے ہیں کہ جو ان کو مزید راہ راست سے ہٹا دیتے ہیں. ایسے ہی ساتھیوں کو بدترین رفیق بیان کیا گیا ہے. سورہ توبہ کی آیات ۳۰، ۳۱ میں ایسے ہی رفقاء کی بابت فرمایا گیا ہے

"…. (اہل کتاب پر) خدا کی مار اِن پر، یہ کہاں سے دھوکہ کھار ہے ہیں (۳۰) انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے …." (۳۱) (سورہ توبہ)

آیت ١٤ میں ایمان لانے باعمل لوگوں کے لئے جنت کی بشارت دی گئی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں پر کس پر ایمان لانے کی بات ہو رہی ہے. اگر کوئی اس کو ایمان باللہ سمجھے تو جس گروہ (یعنی یہود) کے لئے یہ آیت آ رہی ہے تو وہ تو پہلے ہی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں. یہاں پر صرف اسی ایمان کی بات ہو سکتی ہے جس کو ابھی تک انھوں نے قبول نہیں کیا تھا اور اس کو مسترد کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہے تھے. تقریر کے آغاز سے ہی مختلف گروہوں کا جب ذکر ہوا تو ان کی تقسیم علم اور کتاب کے حوالے سے بیان کی گئی ہے. اس بات کو مد نظر رکھا جائے تو اس آیت میں جس ایمان کی بات ہو رہی ہے وہ ایمان بالقرآن ہی ہے.

دوسری جانب سعید بن جبیر ان آیات کی شان نزول کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ بعض لوگ مدینہ آتے (اور اپنے اسلام کا اظہار کرتے) اس کے بعد اگر اس کی بیوی کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا اور گھوڑی بھی بچہ دیتی تو وہ کہتے کہ یہ دین (اسلام) بڑا اچھا دین ہے، لیکن اگر ان کے یہاں لڑکا نہ پیدا ہوتا اور گھوڑی بھی کوئی بچہ نہ دیتی تو کہتے کہ یہ تو برا دین ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب التفسیر)

تفسیر ابن ابی حاتم میں یہی روایت مزید تفصیل سے بیان ہوئی ہے اور اس کے مطابق ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بدوی لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس آتے تھے اور اسلام قبول کر لیتے تھے پھر جب وہ اپنے شہروں کی طرف لوٹتے اور اس سال خوب بارش ہوتی، شادابی سے لطف اندوز ہوتے، خوب بچے پیدا ہوتے تو کہتے ہمارا دین بڑا اچھا، پس وہ اس کی مضبوطی سے پکڑے رہتے اور اگر ان کو قحط سالی کا سامنا کرنا پڑتا، برے بچے پیدا ہوتے، بارش نہ ہوتی تو کہتے ہمارے اس دین میں کوئی خیر نہیں پاس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی.

سعید بن جبیر کی یہ روایت بھی ان روایتوں میں سے ہے جس نے سورہ حج کو اس کے مقام سے ہٹا کر مدنی دور میں پہنچا دیا ہے. حالانکہ بالکل صاف واضح ہے کہ یہ آیت کوئی جدا پس منظر نہین رکھتی بلکہ ایک ایسی تقریر کا حصہ ہے جس میں مختلف نظریات کے لوگوں کا احوال بیان کیا جا رہا ہے. اگر تھوڑی دیر اس آیت کو اس روایت کے تابع کر کے دیکھ بھی لیا جائے تو بھی کئی سوالات اٹھتے ہیں. ایک انسانی حمل ۹ ماہ جب کہ گھوڑوں کا حمل ۱۱ ماہ کا ہوتا ہے، اگر پیمانہ یہی باتیں ہوتیں تو اس کے ادراک کے لیے تو کئی سال لگ جاتے، اور اس دوران تو متعدد مدنی سورتیں نازل ہو ہی رہی تھیں

جہاں یہ موضوع جگہ پا سکتا تھا۔ روایت سے یہ تاثر مل رہا ہے کہ جو بدوی لوگ اسلام قبول کر رہے ہوتے تھے وہ اس امید پر کر رہے ہوتے تھے کہ اسلام قبول کر کے ان کو یہ دنیاوی فوائد حاصل ہوں. کیا اسلام کی دعوت اور نبی کریم ﷺ کی تبلیغ کا بنیادی محور دنیاوی فوائد تھے، کہ اس سے بلاوجہ ہی وہ لوگ ایسی امید باندھ لیتے اور وہ بھی اس صورت میں کہ جب دین کا داعی اور اولین پیروکار دنیاوی لحاظ سے انتہائی شدید سختیاں جھیل رہے ہوں، اپنے گھر بار چھوڑ کر دوسرے ملکوں اور شہروں مین پناہ لینے اور نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوئے ہوں. مزید یہ کہ بیٹوں کی لالچ میں اسلام قبول کرنے والے بدویوں کو کیا خود یہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تو خود چار بیٹیوں کے باپ ہیں اور انکے دو بیٹے بچپن میں ہی فوت ہو چکے ہیں.

یہ درست ہے کہ بعض لوگ کسی دنیاوی اغراض کے لئے دوسرے نظریے قبول کرتے ہیں اور اگر اس کے بعد اگر کوئی فائدہ یا نقصان ہو تو اس سے شگون بھی لیتے ہیں، لیکن مدینہ کا اس وقت جو ماحول تھا کہ جہاں مسلسل جنگ کے خطرات منڈلارہے تھے، وہاں کے مسلمانوں کی معاشی حالت ابتری کا شکار تھی کہ عموماً فاقوں کی نوبت رہتی تھی تو ایسے ماحول سے مالی فوائد کے لیے شگون لیکر کوئی دنیا پرست بدوی اسلام کیونکر قبول کرتا. مسلمان مفسرین کی ایک تعداد سورہ حج کی ابتدائی آیات کو مکی مانتی ہے جس کا احوال پہلے بیان کیا جا چکا ہے، گویا وہ سعید بن جبیر کی اس روایت کو عملاً مسترد کر رہے ہیں. لیکن اس صورت میں بھی اس روایت کا انکار کرکے عملا اقرار ہی کرلیا گیا ہے کہ ان آیات کو اس وقت کے مسلمانوں سے جوڑ کر سورہ حج کی اس تقریر کا تسلسل توڑ دیا ہے، جس کا سب سے زیادہ شکار بالکل اگلی آیات ہوئی ہیں۔

قسط ۵: کیا قرآن میں خود کشی کا جواز موجود ہے؟

آیت ۱۵ اور ١٦ کا بیان: حصہ اول

"جس کو یہ خیال ہو کہ ہرگز مدد نہ کرے گا اس کی اللّٰہ دنیا میں اور آخرت میں تو تانے ایک رسی آسمان کی طرف پھر قطع کر دے، پس دیکھے کچھ گیا اس کی تدبیر سے اس کے جی کا غصہ (۱۵) اور ایسی ہی کھلی باتوں کے ساتھ ہم نے اسے نازل کیا ہے اور ہدایت اللّٰہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے (١٦)"

آیت ۱۵اور ١٦ دراصل آیت ۱۱ تا ١٤ کا ہی تسلسل ہیں اور یہاں اسی تیسرے گروہ سے بات جاری ہے کہ جو کنارے پر رہ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ کیونکہ یہ آیات اسی تقریر کا حصہ ہیں، لہذا ان آیات میں ضمائر میں ہی گفتگو جاری رکھی گئی ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ ضمائر پچھلی آیات اور تقریر کے اصل موضوع ہی کی طرف پھر رہی ہیں۔ لیکن حیرت ناک طور پر سورہ الحج کی آیت ۱۵ سے اتنے مختلف مطالب نکالے ہیں، کہ بعض خودکشی کے جواز اور حکم کی دلالت کرتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ آیت ۱۵ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں "جو آدمی (مایوس) ہو کر ایسا خیال کر بیٹھتا ہے کہ اللّٰہ دنیا اور آخرت میں اس کی مدد کرنے والا نہیں، تو (اس کے لئے زندگی کی کوئی راہ باقی نہ رہی) اسی چاہیے کہ ایک رسی چھت تک لے جا کر باندھ لے اور (اس میں گردن لٹکا کر زمین سے) رشتہ کاٹ لے. پھر دیکھے کہ اس تدبیر نے اس کا غم و غصہ دور کر دیا کہ نہیں؟"

آگے تشریح یہ بیان کرتے ہیں کہ "جس انسان نے امید و یقین کی جگہ شک و مایوسی کی راہ اختیار کی خواہ دنیا کی زندگی کے لئے ہو خواہ آخرت کی لئے، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اب اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں. ایسے آدمی کے لئے صرف یہی چارہ کار رہ جاتا ہے کہ گلے میں پھندا ڈالے اور زندگی ختم کر ڈالے! سبحان اللّٰہ! انسانی زندگی کے تمام مسائل اس ایک آیت نے حل کر دیے. زندگی امید و سعی ہے اور موت مایوسی اور ترک سعی. پس اگر ایک بدبخت نے یہ فیصلہ کر لیا کہ خدا کے پاس اس کے لئے کچھ نہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی تو پھر اس کے لئے باقی کیا رہا؟ کیا ہے جس کے سہارے وہ زندہ رہ سکتا ہے؟ اور زندہ رہے تو کیوں زندہ رہے؟"

کم و بیش یہی رائے مولانا ثنا اللّٰہ امرتسریؒ کی ہے. وہ فرماتے ہیں کہ "جو کوئی اپنے خیال میں یہ گمان کیے بیٹھا ہے کہ خداوند دنیا اور آخرت میں اس کی مدد نہ کرے گا بلکہ یونہی نسیاً منسیا کر دے گا یہ درست نہیں، بلکہ خدا اپنی کسی مخلوق کو نہیں بھولتا

تاہم اتنا سمجھانے سے کسی کی تسلی نہ ہو اور وہ خدا کی نسبت بدگماں ہی ہو تو اسے چاہیے کہ اوپر چھت کی طرف ایک رسی تانے جس کے ساتھ اپنی پھانسی لگائے، پھر اسی رسی کو کاٹ دے جس کے کٹنے سے وہ زمین پر گر کر مر جائے گا. پھر وہ دیکھے کہ اس کی اس تدبیر سے اس کا رنج و غم جو خدا کی ذات کی نسبت کر رہا تھا رفع دفع ہو جائے گا؟"

اس بحث سے قطع نظر کہ شریعت محمدیؐ میں خود کشی جائز ہے بھی یا نہیں، یہ دیکھا جائے کہ اگر کوئی شخص مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہو تو قرآن اس کو امید کا راستہ دکھائے گا یا اس کو مزید مایوسی کی طرف دھکیلے گا کہ وہ اپنی زندگی کا اب خاتمہ ہی کرلے. قرآن کریم میں تو انبیاء کرام کے حوالے سے ایسی دعائیں موجود ہیں کہ جب ان پر سخت وقت آیا تو انھوں نے کن الفاظ میں اللہ سے رجوع کیا. مثلاً حضرت موسیٰؑ، حضرت یونسؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ایوبؑ کی دعایئں موجود ہیں. جیسے سورہ القمر میں حضرت نوحؑ کی دعا

فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانتَصِرْ (١٠)

یا سورہ قصص میں حضرت موسیٰؑ کی دعا

رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ (٢٤)

کوئی اگر اس سے یہ مطلب کہے کہ ناامیدی اگر آخری حد بھی پار کر جائے تو اس کے لئے یہ کہا گیا کہ اب چاہیے کہ خودکشی بھی کرلے لیکن کیا یہی آیت اس بات کی گنجائش دے بھی رہی ہے کہ یہ مفہوم نکالا بھی جائے کیونکہ آیت کے اگلے ہی حصے میں فوراً بعد تو یہ کہا جا رہا ہے کہ "پھر دیکھے کہ اس تدبیر نے اس کا غم و غصہ دور کر دیا کہ نہیں؟" سوچنے کی بات ہے کہ جو شخص خود کشی کر ہی چکا ہو تو اس کے بعد وہ کیونکر دیکھ پائے گا کہ اس کی یہ تدبیر کارگر ہوئی ہے یا بیکار گئی. وہ تو اس دنیا سے اپنا رشتہ ہی کاٹ چکا ہو گا. مزید یہ کہ مولانا امرتسری اپنی تشریح میں فرما رہے ہیں کہ پھانسی کے بعد اپنی رسی کاٹے اور پھر زمین پر گرے. یہ کیسے ممکن ہے کہ جب انسان پھانسی پر جھول ہی چکا تو اسکے بعد وہ رسی کاٹے. ایک اہم نکتہ یہ بھی اٹھتا ہے کہ جو شخص اللہ ہی سے مکمل طور پر مایوس ہو چکا ہو تو وہ اللہ ہی کی بتائی ہوئی اس ہدایت پر عمل ہی کیوں کرے گا کہ اپنی زندگی ختم کرلے، وہ غیر اللہ کا در کیوں نہ کھٹکھٹائے گا؟ باقی اگر آیت ١١ تا ١٤ کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی ایسے کسی شخص کا تاثر نہیں ابھر رہا جو اب مکمل طور پر مایوس ہوگیا ہے، اور اسکو زندگی گزارنے کا کوئی راستہ نہیں سجھائی دے رہا لہذا اسکو خودکشی کی ترغیب یا حکم دیدیا جائے۔ وہاں تو

آزمائش آنے پر الٹے قدموں پھرنے والوں کی حقیقت آیت ۱۲اور ۱۳میں خود واضح کردی ہے کہ الٹے قدموں پھرنے والے پھر ایسی چیزوں اور لوگوں کی طرف راغب ہوجاتے ہیں جو کہ ضرر رساں ہیں۔

انہی آیات کی خود کشی کے حوالے سے ایک دوسری تفسیر بھی کی جاتی ہے آیت میں وارد لفظ یَّنۡصُرَہُ کے "ہُ" کی ضمیر خیال کرنے والے کی بجائے رسول اللہ ﷺ کی طرف پھیری جاتی ہے.

مولانا احمد رضا خان بریلویؒ ترجمہ کرتے ہیں"جو یہ خیال کرتا ہو کہ اللہ اپنے نبیؐ کی مدد نہ فرمائے گا دنیا اور آخرت میں تو اسے چاہیے کہ اوپر کو ایک رسی تانے پھر اپنے آپ کو پھانسی دے لے. پھر دیکھے کہ اس کا یہ دانوں کچھ لے گیا اس بات کو جس کی اسے جلن ہے."

کم و بیش یہی ترجمہ مولانا ثنا اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں بھی کیا ہے. علامہ ابن کثیرؒ اس کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں کہ "یعنی جو یہ جان رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کی مدد نہ دنیا میں کرے گا اور نہ آخرت میں، وہ یقین مانے اس کا یہ خیال محض خیال ہے. آپؐ کی مدد ہو کر ہی رہے گی، چاہے ایسا شخص اپنے غصے میں ہار ہی جائے بلکہ اسے چاہیے کہ اپنے مکان کی چھت میں رسی باندھ کر اپنے گلے میں پھندا ڈال کر اپنے تئیں ہلاک کر دے".

جہاں تک مولانا ابولکلام آزاد کی تفسیر کا سوال ہے تو انھوں نے تو یَّنۡصُرَہُ کے "ہُ" کی ضمیر اپنے حالات سے مایوس کسی بھی شخص کی طرف پھیری ہے. لیکن جب یہ ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف پھیری جائے گی تو لازماً سوال اٹھتا ہے کہ یہ خیال کرنے والا کون شخص ہو سکتا ہے کہ جس کو اللہ پھر خودکشی کر لینے کا جواز فراہم کر رہا ہے. کسی بھی دعوت کے نتیجہ میں تین گروہ پیدا ہوتے ہیں، ایک مومن، دوسرے منکر، اور تیسرے منافق. جہاں تک منکرین کا سوال ہے کہ اگر وہ یہ خیال کریں کہ اللہ اس نبیؐ کی دنیا اور آخرت میں مدد نہیں کرے گا تو یہ تو ان کے لئے خوشی کی بات ہے نہ کہ خودکشی کی. دوسری جانب منافقین کا گروہ ہے. منافقین تو ہوتے ہی وہ لوگ ہیں جو دنیاوی اغراض کے لئے ہر کشتی میں پاؤں رکھتے ہیں. اگر حالات سے ان کو یہ محسوس ہو رہا ہو کہ اللہ اس نبیؐ کی مدد نہ فرمائے گا تو وہ تو بلا جھجھک منکرین کے ساتھ مل جائیں گے اور وہ کس واسطے خودکشی کریں گے، ایسے لوگوں کا تو نظریہ ہوتا ہی صرف انکا دنیاوی مفاد ہے. پچھلی ہی آیات میں ایسے لوگوں کا دستور بیان ہوا ہی ہے کہ اگر

ان پر کوئی آزمائش آتی ہے تو وہ غیر اللّٰہ کے در بھی پکڑ لیتے ہیں. ایسا طبقہ خود کشی کا کوئی رجحان نہیں رکھتا.

تیسرے رہ جاتے ہیں مومنین. نبیؐ کی دعوت سے مخلص افراد میں سے اکا دکا افراد کے لئے یہ تو کسی معمولی درجہ میں فرض بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس وقت کے حالات کی شدید سختی کے باعث مایوسی کی جانب دھکل گئے ہوں اور یہ سمجھے ہوں کہ اتنے سخت حالات شاید اب کبھی نہیں بدلیں گے اور زمین پر رسول اللّٰہ اور مسلمان ایسے ہی سختیاں جھیلتے رہیں گے لیکن دنیاوی حالات سے مکمل طور پر مایوس شخص بھی یہ تو کسی طور بھی نہیں سوچ سکتا کہ اللّٰہ اس رسولؐ کی آخرت میں بھی مدد نہیں کرے گا اگر تو وہ اس دعوت سے کسی درجے میں بھی مخلص ہو. پس اس ضمیر کو نبیؐ کی طرف پھیرنے کے بعد کوئی بھی ایسا گروہ نہیں بچتا جس پر خودکشی والی یہ بات پوری اتر سکے.

تفسیر درمنثور میں سیوطیؒ نے ابن جریر طبری، ابن ابی حاتمؒ، حاکم (انھوں نے اس کو صحیح کہا ہے) اور ابن مردویہؒ کے حوالے سے کہا ہے کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے تھے کہ جو گمان کرتا ہے کہ اللّٰہ اپنے حبیب محمّد کی مدد نہیں کرے گا وہ رسی باندھ لے اپنے گھر کی چھت کے ساتھ اور اپنا گلا دبا دے حتی کہ مر جائے. دوسری جانب عبد بن حمیدؒ اور ابن ابی حاتمؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابن عباسؓ یوں بیان کرتے تھے کہ جو گمان کرتا ہو کہ اللّٰہ اسے رزق نہیں دے گا تو اسے ایسی رسی لینی چاہیے پھر اسے اپنے مکان کی چھت سے باندھنا چاہیے پھر اس کے ساتھ اپنا گلا دبانا چاہیے، پھر اس کو دیکھنا چاہیے کہ اس کو یہ عمل نفع دیتا ہے یا اسے رزق دیتا ہے.

دراصل یہ روایتیں ہی ہیں جنھوں نے ایک سیدھی سی آیت میں سے خود کشی کا جواز بھی ڈھونڈ نکالا ہے. اور سوچنے کی بات ہے کہ ایک ہی صحابیؓ سے یہ روایات بیان کی جا رہی ہیں لیکن خودکشی کے جواز کی وجوہات بالکل مختلف.

قسط ٦:

آیت ۱۵ اور ١٦ کا بیان: حصہ دوم

مفسرین کرام کی بڑی تعداد ایسی بھی ہے جس نے آیت ۱۵ کو خودکشی کے حوالے سے طنز یا جواز کے ساتھ نہیں جوڑا ہے، تاہم ان میں بھی پہلے گروہ کی طرح اس بات میں اختلاف ہو گیا ہے کہ اس آیت میں وارد لفظ 'ینصرہ' کی ضمیر 'ہ' کا مرجع کون ہے۔

ابو مسلم اصفہانیؒ اس ضمیر کو رسول اللہ ﷺ کی طرف پھیرتے ہیں آسمان تک پہنچ کر کاٹنے کے لیے اللہ کی مدد کو مراد لیتے ہیں اور اس کے معنی یوں بیان کرتے ہیں کہ نصرت الٰہی تو رسول کی تائید میں یقیناً ظاہر ہو گی. جو شخص اس بات پر ناراض ہو کہ یہ نصرت نبیؐ کو کیوں مل رہی ہے تو چاہیے کہ وہ کسی ذریعہ سے آسمان پر پہنچ جائے اور اس نصرت کا رشتہ دنیا سے کاٹ دے. امام قرطبیؒ کی بھی یہی رائے ہے.

دوسری جانب اس ضمیر کا مرجع رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہوئے بھی آسمان تک پہنچ کر کاٹنے کی رائے وحی الٰہی کے حوالے سے بھی ملتی ہے۔ اسی رائے کو مد نظر رکھتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ آیت ۱۵ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ:

" جو شخص یہ خیال رکھتا ہے کہ اللّٰہ اپنے رسولؐ کی مدد دنیا اور آخرت میں نہیں کرے گا تو اسے چاہیے کہ ایک رسی آسمان تک تان لے اور پھر سلسلہ وحی کو کاٹ دے. تو غور کرنا چاہیے کہ آیا اس کی تدبیر اس کی ناگواری کی چیز کو موقوف کرا سکتی ہے؟ (۱۵)

یہی رائے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بھی ہے، فرماتے ہیں "نصرت الٰہیہ آپ کے ساتھ بوجہ نبوت اور وحی کے ہے. سو آپ کی ناکامی کی سعی کرنا اس وقت مفید ہو سکتی ہے کہ جب اس نبوت اور وحی کے قصے کو پاک کر دیا جاوے. سو یہ ہونے کا نہیں."

دوسری جانب ایک گروہ اس ضمیر کا مرجع خود گمان رکھنے والے شخص کو قرار دیتا ہے؛ یعنی جو شخص اپنے بارے میں یہ گمان رکھے کہ اللہ اسی کی دنیا و آخرت میں مدد نہیں کریگا۔ مولانا سید ابو الاعلی المودودیؒ نہ صرف اس ضمیر کو گمان کرنے والے کی طرف پھیرتے ہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی طرف پھیرے جانے کا رد بھی کرتے ہیں، کیونکہ انکا ماننا ہے کہ یہ سیاق و سباق سے غیر متعلق ہے۔

مولانا مودودیؒ صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ گمان کرنے والا شخص وہی ہے جو کنارے پر کھڑا ہو کر بندگی کرتا ہے. جبتک حالات اچھے رہتے ہیں مطمئن رہتا ہے اور جب کوئی آفت یا مصیبت آتی ہے یا کسی ایسی حالت سے دوچار ہوتا ہے جو اسے ناگوار ہے تو خدا سے پھر جاتا ہے. اور ایک ایک آستانے پر ماتھا رگڑنے لگتا ہے. اس شخص کی یہ کیفیت کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ قضائے الٰہی پر راضی نہیں اور یہ سمجھتا ہے کہ قسمت کے بناؤ اور بگاڑ کے سب رشتے اللّٰہ کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں بھی ہیں. اور اللّٰہ سے مایوس ہو کر دوسرے آستانوں سے امیدیں وابستہ کرتا ہے. اس بنا پر فرمایا جا رہا ہے کہ جس شخص کے یہ خیالات ہوں وہ اپنا سارا زور لگا کر دیکھ لے حتی کہ اگر آسمان کو پھاڑ کر تھگلی لگا سکتا ہو تو یہ بھی کر کے دیکھ لے کہ آیا اس کی کوئی تدبیر تقدیر الٰہی کے کسی ایسے فیصلے کو بدل سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے. آسمان پر پہنچنے اور شگاف

دینے سے مراد ہے کہ وہ بڑی سے بڑی کوشش جس کا انسان تصور کر سکتا ہو. ان الفاظ کا کوئی لفظی مفہوم مراد نہیں ہے."

مولانا مودودیؒ اور مولانا آزادؒ دونوں نے ینصرہ کا مرجع خود گمان کرنے والے کو مانا ہے، لیکن آسمان کی جانب رسی تاننے کے الفاظ سے قطعاً متضاد معنی لیے ہیں، مولانا آزادؒ فرماتے ہیں کہ جو اللہ کی مدد سے انتہائی درجہ میں مایوس ہو گیا ہو، تو وہ تو بس ایسا ہی ہے کہ اب چھت پر رسی تان کر خودکشی کرلے، دوسری جانب مولانا مودودیؒ اسی بات کو آسمان میں تھگلی لگانے کے استعارے کے طور لیتے ہیں، کہ اگر اللہ سے مایوس ہو گئے ہو تو اپنے تئیں آخری حد تک جاکر کوشش کرلو، اور دیکھو کہ جو چیز ناگوار ہے اسکو اپنے بل پر دور کر بھی سکتے ہو یا نہیں- یعنی ایک کوشش کرنے کا بالکل انکار کر رہا ہے، تو دوسرا ناممکنات کی حد تک کوشش کرنے کے چیلنج کا بیان کر رہا ہے۔

مولانا مودودیؒ کی رائے قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ آرہی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں میں مدد نہ ہونے کے گمان کی بات کر رہا ہے، جبکہ انہوں نے آیات ۱۱ تا ۱۳ کی روشنی میں جو رائے دی ہے وہ خالصتاً دنیاوی معاملہ کو لیکر بنتی ہے، کہ کوئی شخص قضائے الہی پر راضی نہیں ہے۔ اسی میں ایک پہلو مزید یہ بھی سامنے آتا ہے کہ مولانا مودودیؒ کے نذدیک اس سورت کی ابتدائی ٢٤ آیات مکی دور کے بالکل آخر کی ہیں، کیا مسلمانان مکہ پر انکی پیش کردہ تفہیم کے ساتھ اس آیت کا اطلاق ہو بھی سکتا تھا، جو کہ اتنے سالوں سے سختیاں جھیل رہے تھے لیکن اپنے نظریہ میں پوری طرح مستحکم کھڑے تھے۔ مکی دور کے بالکل آخر میں مدینہ کے شہری بھی اسلام لا چکے تھے، تاہم ان پر ابھی باقاعدہ آزمائشوں کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا، کہ ان میں سے بھی کسی پر ان آیات کا اطلاق کیا جاتا۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ بھی مولانا مودودیؒ کی رائے سے اتفاق رکھتے ہوئے فرماتے ہیں " جن لوگوں نے اس کا مرجع رسول اللہ ﷺ کو مانا ہے ان کی رائے سیاق و سباق کلام سے بالکل بے جوڑ ہے آیت میں اشارہ انہی دو دلوں اور منافقوں کی طرف ہے جن کا ذکر اپر سے چلا آ رہا ہے اور جن کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ اگر انھیں آزمائش پیش آ جاتی ہے تو خدا سے مایوس و بدگمان ہو کر دوسروں کو مولی و مرجع بنا بیٹھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پیش آمدہ مشکل سے خدا ان کو نہیں نکالے گا یا نہیں نکال سکتا". آسمان میں رسی تاننے کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ وہ مایوس شخص "آخری اور انتہائی تدبیر کر کے دیکھ لے" اور اس کو انھوں نے استعارہ مانا ہے جیسے ہماری زبان تھگلی لگانے کا استعارہ ہے".

شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ اسی آیت کی تفسیر ایک دوسرے انداز سے کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"دنیا کی تکلیف میں جو خدا سے نا امید ہوکر اسکی بندگی چھوڑ دے اور جھوٹی چیزیں پوجے، جن کے ہاتھ نہیں، برا بھلا وہ اپنے دل کے ٹھہرانے کو یہ صورت قیاس کرلے جیسے ایک شخص اونچی رسی سے لٹک رہا ہے اگر چڑھ نہیں سکتا توقع تو ہے کہ رسی اوپر کھینچے تو چڑھ جاوے، جب رسی توڑدی، پھر کیا توقع، رسی کہا اللہ کی امید کو اور آسمان کو تانے یعنی اونچان کو"۔

شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی اس رائے کو ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے بھی اختیار کیا ہے۔ اور اسی رائے کو آگے بڑھاتے ہوئے جاوید احمد غامدی صاحب اس آیت کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں:

"(اِنھیں بتاؤ کہ) جو یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں ہرگز اُس کی مدد نہ کرے گا، اُس کو چاہیے کہ (اپنے تصور میں ذرا) ایک رسی (اوپر چڑھنے کے لیے) آسمان کی طرف تانے، پھر (جب منزل کو بہت دور دیکھ کر رنجیدہ ہو تو) اُس کو کاٹ دے اور دیکھے کہ آیا اُس کی یہ تدبیراُس کے رنج کو دور کرنے والی بنتی ہے؟

غامدی صاحب اس آیت میں منظر کشی ایک انتہائی درجہ کے مایوس شخص کی کر رہے ہیں، لہذا آیت کے آخر میں انہوں نے لفظ 'غیظ' کا ترجمہ 'رنج' سے کیا ہے۔ لیکن اس لفظ کا ترجمہ 'غصہ' سے کیا جائے تو مایوس آدمی کا وہ تاثر نہیں ابھرتا ہے جو وہ پیش کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے مولانا مودودیؒ کی رائے، غامدی صاحب کی رائے کی نسبت آیت کے متن سے زیادہ قریب ہے۔

حاصل کلام:

مولانا مودودیؒ ہوں یا مولانا اصلاحیؒ، دونوں کے نذدیک ینصرہ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف اس لیے نہیں پھیری جا سکتی کیونکہ انکے مطابق پچھلی آیات میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر نہیں ہے، لہذا یہ بات اصولاً درست نہیں ٹھہرتی کہ کسی ضمیر کو ایک ایسی جانب پھیردیا جائے، جسکا پچھلی آیات میں تذکرہ ہی نہ ہو۔ مولانا مودودیؒ ہوں یا مولانا اصلاحیؒ، دونوں ان آیات کو مکی مانتے ہیں، لیکن پھر بھی کنارے پر رہ کر عبادت کرنے والوں کے لیے وہ سعید بن جبیر کی روایت کو ایک درجہ میں مسترد کرنے کے باوجود بھی قبول کر گئے ہیں۔ جبکہ سورت کے مضمون کے تناظر میں غور کیا جائے تو بالکل ہی دوسری بات سامنے آرہی ہے۔ اس سورت میں جن تین گروہوں کا ذکر ہو رہا ہے انکی تفریق میں علم اور کتاب کا حوالہ بہت بنیادی اساس رکھتا ہے۔ ان آیات ۱۵-۱٦ کے

فوری بعد سورت میں جو آیت ١٧ بیان ہوئی ہے اس میں بعض اہل کتاب اور غیر اہل کتاب گروہوں کا ذکر ہے، پھر تقریر کی اختتامی آیت ٢٤ میں پھر مسلمانوں کو اچھے قول کی طرف ہدایت کی بات کی گئی ہے۔ دیکھا جائے تو اس پوری تقریر کا محور ہی نبی پاک ﷺ کی جانب آنے والی وحی ہے۔

لہذا سیاق و سباق کے تناظر میں بات کی جائے تو ان آیات کا وہی ترجمہ درست ہے، جو مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے پیش کیا ہے، کہ یہ ضمیر رسول اللہ ﷺ کی جانب ہی پھر رہی ہے، اور جو چیز قطع کرنے کی بات ہو رہی ہے، وہ وحی ربانی ہے۔ آیت ١١ تا ١٤ میں واضح کیا گیا تھا کہ یہاں اہل کتاب گروہوں اور ان میں بھی بالخصوص یہود مدینہ کی بات ہو رہی ہے، کیونکہ یہ وہ وقت تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آنے والے تھے، اور ایک غیر اسرائیلی نبی کی دعوت کو قبول کرنا ان کے لیے سوہان روح ثابت ہو رہی تھا۔ آیت ١١ میں یہ بیان ہوا تھا کہ جب غیر قوم کے نبیؐ کو قبول کرنے کی آزمائش سامنے آئی ہے، تو الٹے قدموں نہ پھرو، کیونکہ پھر دنیا و آخرت دونوں کا خسارا رہے گا۔ آیت ١٢اور ١٣ میں دانستہ حق سے آنکھیں چرانے والوں کے انجام سے آگاہ کیا گیا ہے، آیت ١٤ میں ایمان لانے کی بات کی گئی ہے، اور ظاہر ہے یہودیوں کے تناظر میں یہ ایمان بالقران اور ایمان بالصاحب القران بنتا ہے، کیونکہ اللہ پر تو اس گروہ کا پہلے ہی ایمان تھا۔ یہ پس منظر اور یہودیوں کی دعوت کو رد کرنے کے حقیقی خلجان کو مدنظر رکھا جائے، تو کوئی وجہ نہیں بنتی کہ یہاں ضمیر رسول اللہ ﷺ کی جانب نہ پھیری جائے۔

پچھلی تقریر کے تناظر میں آیت ١٤ تا ١٦ کا ترجمہ

جو لوگ (اس وحی پر) ایمان لائے اور عمل نیک کرتے رہے خدا ان کو بہشتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں چل رہیں ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے (١٤) جو (کنارے پر رہ کر عبادت کرنے والا) شخص یہ خیال کرتا ہو کہ اللّٰہ دنیا اور آخرت میں اس (صاحب وحیؐ) کی مدد نہیں کرے گا تو اسے چاہیے کہ آسمان تک ایک رسی لٹکائے، پھر (وحی کو) قطع کر دے، پس دیکھ لے کہ آیا اُس کی تدبیر کسی ایسی چیز (اس وحی کے نزول) کو رد کر سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے (١٥) ایسی ہی کھلی کھلی باتوں کے ساتھ ہم نے اس (وحی) کو نازل کیا ہے، اور ہدایت اللہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے (١٦)

آیت ١١ میں فرمایا گیا تھا کہ اگر اہل کتاب تمہارے خیال میں سب درست چل رہا ہوتا ہے تو اللہ کی عبادت کر لیتے ہو، اور اگر کوئی آزمائش آجائے، جیسا کہ ایک اُمی نبیؐ کی دعوت پر ایمان لانے کی بات ہوئی ہے تو تم لوگ الٹے پیروں پھر رہے ہو۔ ایسا کروگے تو

دنیا و آخرت میں خود اپنا نقصان کرو گے۔ آیت ۱۲ میں انہی کی تاریخ سے بیان کیا گیا کہ جب یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے تو وہ مواقع بھی آتے ہیں کہ غیر اللہ کی پرستش شروع کردی گئی ہو، شمال کے دس قبائل میں تو یہ بیماری بہت بڑے طبقے میں آگئی تھی۔
آیت ۱۳ مین ان کے رہبان و علماء کے حوالے سے بیان ہوا ہے کہ ان کی اندھی تقلید مین نفع کم اور نقصان زیادہ ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت میں رکاوٹ پیدا کرنے والوں میں ہراول دستہ یہود کے فریسی علماء کا ہی تھا۔ آیت ۱٤ مین نبی کریم کی دعوت قبول کرنے والوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ آیت ۱۵ مین بیان ہوا ہے کہ اپنے بغض میں تم اس نبیؐ کی دعوت میں روڑے اٹکاؤ گے یا لوگوں میں شکوک ہیدا کرنے کی کوشش کرو گے (جن کے کچھ حوالے اسی سورت کی اگلی آیات میں بھی دیے گئے ہیں) تو تم لوگ منہ کی ہی کھاؤ گے، آخری حربہ کے طور پر اگر آسمان پہنچ کر اس وحی کے سلسلے کو روک سکتے ہو تو یہ بھی کرکے دیکھلو، کیونکہ اسکو روک دینا تمہارے بس میں ہی نہیں ہے۔ اللہ تو اس نبیؐ اُمی کی مدد دونوں جہانوں میں ضرور کریگا، چاہیے تم لوگ جتنا بھی پیچ و تاب کھالو۔ اور حق بات یہی ہے کہ اس نبیؐ کی دعوت کو قبول کرلو جس کا ذکر آیت ۱٤ میں ہے۔

آیت ١٦ اور دور نزول کی اہمیت:

ان آیات پر ایک دیگر پہلو سے بھی غور کرنا ضروری ہے۔ آیت ۱۵ کے فوری بعد آیت ١٦ میں اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

ایسی ہی کھلی کھلی باتوں کے ساتھ ہم نے اس (وحی) کو نازل کیا ہے، اور ہدایت اللہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے (١٦)

اگرچہ پورا قران ہی مبین ہے، لیکن یہاں تخصیص کے ساتھ آیت ۱۵ کی بات ہورہی ہے۔ اللہ تعالیٰ دعوی کر رہا ہے کہ آیت ۱۵ بالکل کھلی بات ہے، لیکن ہمارے سامنے ہے کہ یہ آیت مشکلات القران مین داخل ہوگئی ہے۔ صرف اسی مضمون میں چند اردو تراجم و تفاسیر کے حوالے سے کم از کم پانچ مختلف الخیال تفاہیم اس آیت کے متعلق پیش کی گئی ہیں۔ بالفرض اگر اولین مخاطب لوگوں کی تفہیم میں بھی اتنا ہی شدید تضاد ہوتا، تو آیت ١٦ کے حوالے سے ان کے ذہنوں میں سوال ضرور اٹھتا کہ یہ بات تو ہر گز بھی کھلی ہوئی نہیں ہے۔ یہ بات اس وقت اس لیے نہیں ہوئی کہ یہ سورت اُن لوگوں کے سامنے جب نازل ہو رہی تھی، اس وقت کے حالات ان کی نگاہوں میں تھے کہ یہ جاننا چنداں مشکل نہ تھا کہ کن لوگوں کے حوالے اس سورت میں دیے جارہے ہیں۔ قران کریم آج بھی اتنا ہی مبین ہے، وہ ایسی تمام سورتوں، جن کی تفہیم میں بعد کے لوگوں کے لیے

اختلاف پیدا ہو سکے، ضرور ان سورتوں میں ایسے اشارے رکھتا ہے کہ انکا دور نزول متعین کیا جاسکے۔ آج بھی قران کو سمجھنے کے لیے شان نزولوں کی بجائے، سورتوں کی اندرونی شہادوتوں سے حاصل شدہ ان کے دور نزول کا تعین کیا جائے، تو مختلف الخیال لوگوں کے اس وقت کے نظریات ہمارے سامنے آجائیں گے، اور پوری سورت کی تفہیم نہایت سہل ہو جائے گی۔

ایک مزید پہلو:

شان نزولوں کے حوالے سے ایک پہلو اور بھی سامنے آتا ہے، کہ وہ تمام آیات جن میں یہود کا نام لیے بغیر ان کی سرزش ہو، کوئی نہ کوئی شان نزول ایسی ضرور ہوتی ہے جو ان متعلقہ آیات کا مخاطب کسی دوسرے گروہ کی جانب پھیر دیتی ہے۔ تحویل قبلہ کا معاملہ ہو، مباہلہ کا قصہ ہو، سورہ جمعہ کی آخری آیت ہو یا سورہ حج کی زیر بحث آیات، تمام ہی جگہوں پر شان نزولوں نے یہود کی پردہ پوشی کرکے کسی دوسرے گروہ کو کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے۔ یہ بات اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ مسلمانوں کی دوسری اور تیسری پیڑھی میں ضرور کچھ ایسے لوگ شامل ہوئے تھے جو یہود کے ساتھ مل کر یحرفون الکلم عن مواضعہ کا کام کر رہے تھے۔

آیت ١٧ تا ١٨ کا بیان:

"جو لوگ ایمان لائے، اور جو یہودی ہوئے، اور صابئی، اور نصاریٰ، اور مجوس، اور جن لوگوں نے شرک کیا، ان سب کے درمیان اللہ قیامت کے روز فیصلہ کر دے گا، ہر چیز اللہ کی نظر میں ہے (١٧) کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سربسجود ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اور بہت سے ہیں کہ جن پر عذاب مقرر ہو چکا ہے اور جسے اللہ ذلیل و خوار کر دے اُسے پھر کوئی عزّت دینے والا نہیں ہے، اللہ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے (١٨)"

یہ آیت سورہ الحج کی اس تقریر (آیات ١ تا ٢٤) کی مرکزی آیت ہے کہ جس میں دو ایسی بھی اقوام کا ذکر ہے کہ جن سے مذہبی حوالے سے مسلمانوں کا سابقہ اس وقت تک نہیں پڑا تھا۔ صابی اور مجوسیوں کا ذکر واضح کرتا ہے کہ یہاں بیان عالمی حالات کے تناظر میں کیا گیا ہے نہ کہ مقامی۔ قران کریم کا یہ واحد مقام ہے کہ جس میں مجوس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مجوسی زرتشت کو ماننے والے ایران کی آتش پرست قوم تھے۔ اگرچہ دعوی انکا بھی یہی ہے کہ وہ توحیدی ہیں اور اہورا مزدا کائنات کا خدا ہے، تاہم مروجہ مجوسیت ثنویت کی قائل تھی، یزدان اور اہرمن کی صورت میں اچھائیوں اور برائیوں کے دو مختلف خدا موجود تھے۔ مجوسی اوِستا نامی کتاب کو بھی مانتے ہیں۔

دوسرا گروہ جس کا ذکر ہے وہ صابیوں کا ہے۔ قران مجید میں یہ پہلا مقام ہے کہ جب صابیوں کا ذکر ہوا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ ذاتی نہیں بلکہ صفاتی نام ہے۔ قران میں صابیوں کا ذکر جب بھی ہوا ہے تو اہل کتاب گروہوں کے ساتھ ہوا ہے۔ سورہ الحج کے بعد نازل ہونے والی سورتوں سورہ بقرہ اور سورہ مائدہ میں بھی صابیوں کا ذکر ہے، اور وہاں تو گفتگو ہی اہل کتاب سے ہو رہی ہے۔ تاہم سورہ الحج میں بھی صابیون کا ذکر دو مسلمہ اہل کتاب گروہوں یہودیوں اور نصرانیوں کے درمیان کیا گیا ہے۔ قران مجید میں صابی کا لفظ جب بھی استعمال ہوا ہے، تو مقابلہ میں نصاری کی مانند یہود کا لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ 'وہ جو یہودی ہوگئے' استعمال کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی معیت میں نبی اسرائیل کے بارہ قبیلے مصر سے نکلے ۔ بعد میں ایک وقت میں حضرت یوشع بن نون کی ہمراہی میں فلسطین میں داخل ہوئے۔ صدیاں بیت گئیں اور حضرت سلیمانؑ ان کے آخری مشترکہ حکمران رہے، حضرت سلیمانؑ کا تعلق قبیلہ یہودہ سے تھا۔ ان کی وفات کے بعد شمال کے دس قبائل نے بغاوت کردی اور سامریہ کے مقام پر اپنا نیا دالحکومت بنایا۔ جبکہ جنوب کے قبائل نے اس وقت اپنے آپکو یہودی قرار دیدیا کیونکہ ان

میں سب سے بڑی تعداد یہودہ کی اولاد میں سے تھی، اور حکمران بھی یہودہ ہی کی اولاد میں سے تھا، انہوں نے اپنی مملکت کا نام بھی یہودہ رکھ لیا تھا- شمال کے ۱۰ قبائل پر مشتمل اس قوم کو قران نے صابی کہا ہے کیونکہ بغاوت کرنے والے کے لیے صبا علیہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بعد کے ادوار میں اس قوم کے اندر یہودی قوم کے مقابلہ میں زیادہ گمراہیاں پیدا ہوئیں۔ یہاں تک کہ بت پرستی کو بھی ایک طبقے میں رواج مل گیا۔ مرور زمانہ سے یہ قوم بتدریج فنا ہوتی چلی گئی، حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں ان کے سابقہ دارالسلطنت کی نسبت سے انکو سامری کہا جاتا تھا، یہ قوم آج بھی نہایت قلیل تعداد میں موجود ہے، اور توریت پر عمل پیرا ہونے کی دعویدار بھی ہے۔

سورہ الحج کے آغاز میں جو پہلا گروہ بیان ہوا تھا، وہ مشرکین کا تھا، جبکہ دوسرے کا ذکر جب ہوا تو خسرو پرویز بطور نمائندہ زیر بحث آیا۔ تیسرا گروہ اہل کتاب کا تھا جو کہ کنارے پر رہ کر اللہ کی عبادت کر ہی رہے تھے، ان مین نمائدگی مدینہ کے یہود کو دی گئی اور ان سے بالواسطہ خطاب بھی ہوا۔ آیت ١٦ پر تیسرے گروہ کا ذکر ختم ہوا۔ اور اب مجموعی بحث کا آغاز ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے ایمان لانے والے گروہ کا ذکر ہے، یعنی کہ مسلمان۔ لیکن یہاں یہ دھیان رہے کہ دیگر گروہ بالخصوص وہ جو یہودی ہوئے، اور وہ جو صابی تھے، دونوں ہی توحید پر ایمان رکھتے تھے، نصاری بھی تثلیث کے باوجود توحید کے ہی دعویدار ہیں، اور نبی کریمؐ کے زمانے میں تو موحد عیسائی بھی بڑی تعداد میں تھے۔ فلسفیانہ تاویلات کے بعد مجوس بھی وحدانیت کے ہی قائل ہیں۔ مشرکین بھی یہ تو مانتے تھے کہ ایک اللہ ہے لیکن اس کے ساتھ سینکڑوں دیگر خداؤں کو بھی مانتے تھے۔ لہذا جب ان الذین امنوا کا لفظ ان مذاہب بالخصوص یہود کے مقابلہ میں آئے گا، تو وجہ تفریق محض ایمان باللہ نہیں بلکہ ایمان بالرسالت اور ایمان بالقران بھی ہوگی۔ اس تقریر کا محور ہی علم، کتاب وحی اور صاحب وحی ہیں۔ آیت میں ان تمام گروہوں کے درمیان روز قیامت فیصلہ کردینے کا ذکر کیا گیا ہے۔

آیت ۱۸ میں بیان ہے کہ آسمان والے یعنی فرشتے بھی اللہ کے اگے سجدہ ریز ہیں، اور زمین والے یعنی مومنین صادقین بھی اللہ کے اگے سجدہ ریز ہیں، اور زمین و آسمان کی تمام غیر مکلف جاندار و بے جان مخلوق بھی اللہ کے اگے سجدہ ریز یا اسکے حکم کے تابع ہے۔ اس کے بعد بہت سے انسانوں کے سجدہ کرنے کا ذکر ہوا ہے- سورت کے آغاز سے ہی جب مختلف گروہوں کا ذکر ہو رہا تھا، تو وہاں الناس سے غیر مسلم گروہ ہی مراد تھے، ومن الناس (لوگوں میں سے کئی) سے آیت کا آغاز ۳ کا آغاز ہوا ، پھر آیت ۸ میں اور پھر ۱۱ میں یہی الفاظ شروع میں تھے، اور کبھی ان سے مشرک مراد رہے تو کبھی مجوس تو کبھی

اہل کتاب۔ آیت ١٧ میں مسلمانوں کے مقابلے میں انکا فرداً فرداً ذکر ہوا اور اب آیت ١٨ میں ان تمام گروہوں کو الناس میں جمع کرکے بیان کیا گیا ہے کہ ان غیر مسلم لوگوں میں سے بھی تو کئی اللہ کے آگے سجدہ ریز ہی ہیں ، باقی بہت سے ان میں سے ایسے بھی ہیں جو اب عذاب کے مستحق ہوچکے ہیں۔ ظاہر ہی بات ہے کہ جو لوگ اللہ کے اگے سجدہ ریز ہونے والی قوموں میں سے ہوں اور پھر بھی عذاب کی مستحق ٹھہرے ہوں، تو بنیادی فرق رسول ﷺ اور اس کتاب قران پر بھی ایمان لانے کا ہوا۔

"یہ دو فریق ہیں جو اپنے رب کے معاملہ میں جھگڑتے ہیں پھر جو منکر ہیں ان کے لیے آگ کے کپڑے قطع کیے گئے ہیں اور ان کےسروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا (١٩) جس سے جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے اور کھالیں جھلس دی جائیں گی (٢٠) اور ان پر لوہے کے گرز پڑیں گے (٢١) جب گھبرا کر وہاں سے نکلنا چاہیں گے اسی میں لوٹا دیئے جائیں گے اور دوزخ کا عذاب چکھتے رہو (٢٢) بے شک اللّٰہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہاں انہیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائیں جائیں گے اور وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا (٢٣) اور انہوں نے عمدہ قول کی راہ پائی اور تعریف والے اللّٰہ کی راہ پائی (٢٤)"

یہاں دراصل آیت ١٨ میں بیان کردہ دو فریقوں کی بات ہورہی ہے، ایک تو وہ جو زمین والے سجدہ گزار ہیں، یعنی کہ مومنین، اور دوسرا گروہ الناس کا ہے کہ جس کے اندر اہل کتاب و غیر اہل کتاب مذہبی گروہ اور مشرکین سب شامل ہیں۔ امام حجت کے بعد ان گروہوں میں سے جو فرد بھی ایمان نہ لایا اس کے اخروی عذاب کا بیان آیت ٢٢ تک بیان ہوا ہے اور جو ایمان لے آیا اس کے لئے اخروی نعمتوں کا بیان آیت ٢٣ میں کیا گیا ہے۔ اور آیت ٢۴مین بیان ہوا کہ یہ اس لیے ہوگا کہ انہوں نے عمدہ قول (قران مجید) اور تعریف والے اللہ کی راہ پالی۔ یہ اس سلسلہ تقریر کی آخری آیت ہے۔ اس تقریر کا محور ایمان بالقران ہی ہے۔ اور اب اختتامی آیت مین بھی قران کریم کے حوالے سے ہی جو اللہ کی راہ پکڑیں گے، وہی جنت کے مستحق ٹھہریں گے اگرچہ یہود اور کئی دیگر گروہ ایک اللہ کی عبادت کے دعویدار ہیں- قران میں اس مقام کے علاوہ بھی خود قران کے لیے قول کا لفظ استعمال ہوا ہے، مثلاً سورہ الطارق کی آیت ١٣میں قران کریم کے لیے انہ لقول فصل استعمال ہوا ہے، اسی طرح سورہ القصص کی آیت ۵١ میں کتاب الہی کے لیے ولقد وصلنا لهم القول لعلهم يتذكرون استعمال ہوا ہے۔

سور الحج کی ان آیات کو خالی الذہن ہوکر پڑھا جائے، اور ان آیات میں موجود اشاروں سے ہی مضمون کا اصل مدعا دیکھا جائے نہ کہ باہم متضاد شان نزولوں کے ذریعے، تو کوئی غیر جانبدار شخص یہ نہیں مانے گا کہ یہ آیتیں دس پندرہ سالوں میں بلا کسی ربط کے آگے پیچھے بس یونہی نازل ہوتی رہیں، جن کو نبی پاک ﷺ نے آخری دنوں میں سمیٹ کر ایک سورت کا روپ دیدیا، یا ایک قدم اور آگے بڑھ کر بات کی جائے کہ صحابہ کرامؓ نے اپنے صوابدید پر ان کو جیسے چاہا سورتوں میں ڈھال دیا۔ آیت ۱۸ کے سلسلے میں بھی ایک شان نزول بیان کی جاتی ہے، یہ بھی انھی شان نزولوں مین سے ہے، جس نے ایک مکی دور کی سورت کو مدینہ پہنچادیا۔ اس شان نزول نے تو اتنی شہرت پائی کہ بہت سے وہ لوگ جو سورہ الحج کو مکی مانتے تھے، آیت ۱۸ اور اسکے بعد کی چند آیات کو استثنیٰ دیدیتے تھے۔

ابومجلز راوی کا بیان ہے کہ انہیں قیس بن عباد نے بیان کیا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ قسم کھا کر بیان کرتے تھے کہ یہ آیت "یہ دو فریق ہیں، جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا" حمزہؓ اور انکے دو ساتھیوں (حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہؓ بن حارث) اور عتبہ اور اسکے دو ساتھیوں (شیبہ اور ولید بن عتبہ) کے بارے مین نازل ہوئی تھی، جب انہوں نے بدر کی لڑائی میں میدان میں آکر مقابلہ کی دعوت دی تھی (صحیح بخاری، کتاب التفسیر)

راوی ابو مجلز کے مطابق حضرت ابوذر غفاریؓ نے قسم کھا کر یہ بیان دیا تھا، لیکن حضرت ابوذر غفاریؓ تو نہ غزوہ بدر میں شامل تھے اور نہ ہی غزوہ احد میں۔ لہذا وہ تو اس روایت کےاولین راوی ہو نہیں سکتے تھے۔ آخر انہوں نے اس روایت کو کس صحابی سے سن کر قیس بن عباد کو قسم کھا کر بیان کیا تھا۔ دوسری جانب صحیح بخاری ہی کی کتاب المغازی کے مطابق حضرت علیؓ خود بھی یہی بات قیس بن عباد کو بتاچکے تھے۔

صحیح بخاری ہی کی کتاب المغازی میں ابو مجلز قیس بن عباد کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ حضرت علیؓ نے کہا یہ آیت "یہ دو فریق ہیں، جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا" ہمارے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ (صحیح بخاری، کتاب المغازی)

ابو مجلز عن قیس بن عباد کے کی یہ روایت حضرت علیؓ کے حوالے سے صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں یوں بیان ہوئی ہے کہ حضرت علیؓ نے کہا کہ میں قیامت کے دن سب سے پہلا شخص ہونگا جو رحمن کے سامنے جھگڑے (یعنی مقدمہ) کے لیے گھٹنوں کے بل نیم استادہ ہوگا۔ قیس بن عباد نے کہا کہ یہ آیت "یہ دو فریق ہیں، جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا" ان چھ اشخاص کے بارے مین نازل ہوئی ہے جو بدر کے دن (عمومی

لڑائی سے پہلے) ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے۔ مسلمانوں میں سے حمزہؓ، علیؓ اور عبیدہؓ یا ابوعبیدہ، اور مشرکین مین سے شیبہ، عتبہ اور ولید بن عتبہ (صحیح بخاری کتاب التفسیر)

سوال یہ ہے کہ جب ازروئے روایت صاحب معاملہ حضرت علیؓ بذات خود یہی بات قیس بن عباد کو گوش گزار کرچکے تھے، تو کسی دوسرے کے قسمیہ بیان کی حاجت رہ ہی کیا رہ جاتی تھی کہ اسکے حوالے اگلی نسلوں کو دیے جاتے۔

ابو مجلز کی یہی روایت قیس بن عباد ہی کی سند کے ساتھ صحیح مسلم میں بھی موجود ہے۔ گویا یہ ان روایات میں سے ہے جن پر بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں متفق ہیں۔ یعنی دو مختلف صحابیوںؓ نے صرف قیس بن عباد کو بیان کیا اور اس نے بھی محض ابو مجلز ہی کو بتانے پر اکتفا کیا۔ حیرت کا مقام ہے۔

یہ روایات بھی ان روایات میں سے ہیں جنھوں نے سورہ الحج کو اس کے اصل مقام مکی دور سے نکال کر مدنی دور میں پہنچا دیا ہے. مزید یہ کہ قران مجید کے مبین کلام کو مبہم بنانے میں اسکا اور اسی جیسی دوسری روایات کا پورا پورا ھاتھ ہے۔ آیت کو پڑھا جائے تو اس سے تو کسی درجہ میں بھی یہ تاثر نہیں ابھرتا کہ یہ غزوہ بدر یا کسی غزوہ کے بعد نازل ہوئی ہے، اور اگر بالفرض ہوئی بھی ہے، تو اس سے یہ تاثر بھی نہیں ابھرتا کہ دونوں متحارب گروہوں کے صرف منتخب افراد ہی اس آیت کا وجہ نزول بنے ہیں۔ سورہ حج وہ پہلی سورت ہے کہ جس میں جہاد کی مشروط اجازت آیت ۳۹ میں دی گئی ہے، یہ کیسی بات ہے کہ جہاد کی اجازت کی آیت تو بعد میں آرہی ہو، اور جہاد ہوجانے کے بعد کچھ شریک جنگ افراد کے متعلق آیت پہلے بیان کردی جائے۔ مزید یہ کہ غزوہ بدر کے نتائج پر قران کریم میں پوری ایک سورت سورہ انفال موجود ہے، اگر واقعتاً ابومجلز ہی کی بات درست ہوتی، تو اس آیت کو سورہ انفال کا حصہ ہونا چاہیے تھا نہ کہ سورہ الحج کا۔ آیت کو غور سے پڑھا جائے تو اس میں ضمائر یا پروناؤنز میں بات ہوئی ہے، اور ضمائر میں بات تب کی جاتی ہے کہ وہ ضمیریں پچھلے کلام کی طرف پھر رہی ہوں، یا موضوع کے مرکزی مضمون کی طرف بصورت دیگر وہ اتنی واضح ہوں کہ پڑھنے والے یا سننے والے کا ذہن خود بخود حقیقی مراد تک پہنچ جائے خواہ اسکا ذکر اس سے پہلے کلام میں آیا ہو یا نہیں۔ یہ روایت تو ان میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہیں کرتی ہے، خود ابو مجلز کا دعوی ہے کہ حضرت ابو ذر غفاریؓ کو قسم کھا کر یقین دلانا پڑا تھا کہ یہاں مراد حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ یا عتبہ شیبہ ہیں۔ گویا یہ ضمیریں اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے پچھلی آیات یا مرکزی مضمون کی طرف پھرنے کی بجائے قرآن سے باہر کسی

روایت کی محتاج بن گئی ہیں۔ اور اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ قرآن مبین کلام نہیں رہا بلکہ ایک ضمیمے کا محتاج ہو گیا ہے. ابو مجلز کی اس روایت یا اس نوعیت کی دوسری روایتوں نے مسلمان امت کے ذہن میں یہ تاثر پیدا کر دیا ہے کہ سورت کی آیات میں کوئی باہمی ربط نہیں ہوتا،اور قران ایک منتشر کلام ہے، اور ان روایات کے دفاع نے اس تاثر کو مزید گہرا کردیا ہے۔

باوجود اس کے کہ یہ روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے، مولانا مودودیؒ نے اس کا کھلے لفظوں میں انکار کر دیا ہے. فرماتے ہیں "اس آیت کے متعلق بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت مدنی ہے لیکن اس قول کی بنیاد صرف یہ ہے تو ان کے نزدیک ان دو فریقوں سے مراد جنگ بدر کے فریقین ہیں اور یہ کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے. سیاق و سباق میں کوئی چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو اس اشارے کو اس جنگ کے فریقین کی طرف پھیرتی ہو. الفاظ عام اور سیاق عبارت صاف بتا رہا ہے کہ اس سے مراد کفر و ایمان کی اس نزاع عام کے فریقین ہیں جو ابتدا سے چلی آ رہی ہے اور قیامت تک جاری رہے گی. جنگ بدر کے فریقین سے اس کا تعلق ہوتا تو اس کی جگہ سورہ انفال میں تھی نہ کہ اس سورے میں اور اس سلسلہ کلام میں. یہ طریقہ تفسیر اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قران کی آیات بالکل منتشر طریقہ پر نازل ہوئیں اور پھر ان کو بلا کسی ربط و مناسبت کے بس یوں ہی جہاں چاہا لگا دیا گیا. حالانکہ قرآن کا نظم کلام خود اس نظریے سب سے بڑی تردید ہے".

واضح رہے کہ مولانا مودودیؒ یہ بات صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی متفق علیہ روایت کے بارے میں کہہ رہے ہیں. مولانا مودودیؒ نے تفہیم القران میں اس نوعیت کی کئی روایتوں کو صراحتاً اور کنایتاً مسترد کیا ہے کہ جو نظم کلام کو پوری طرح توڑ رہی تھیں، چاہے وہ بہت اعلیٰ درجہ کی کتب کی روایات ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی وجہ سے بعض روایت پرستوں نے ان کو منکر حدیث تک کہہ دیا تھا۔ اس روایت کے متن کو اگر ایک طرف رکھیں تو بھی اس کی سند کوئی بہت اعلیٰ درجہ کی نہیں ہے. اگرچہ وہ راوی جو بخاریؒ اور مسلمؒ میں راہ پا چکے ہیں ان کے لیے دستور یہ بنادیا گیا ہے کہ جرح ہی نہ کی جائے یا پھر انتہائی نرم الفاظ میں کی جائے تاکہ روایت کا پورے طور دفاع ہو سکے، خواہ اس سے قران کا بیان تہس نہس ہی کیوں نہ ہوجائے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یحییٰ بن معین کی ابو مجلز کے متعلق یہ جرح مل جاتی ہے کہ ابو مجلز مضطرب الحدیث تھا. ابو داؤد الطیالسی شعبہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ہمیں اسکے بارے میں خبریں پہنچی کہ یہ شخص شیعہ تھا اور یہ بھی کہ یہ شخص عثمانی تھا. اب چاہے یہ

عثمانی ہو یا شیعہ یا ان میں سے کچھ بھی نہ ہو، لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی بیٹھک ان نظریات کے لوگوں کے سنگ ضرور تھی اور اس کی یہی روایت اس کا بین ثبوت ہے. سلسلہ کلام سے توڑ کر ایک جانب ایک مکی آیت کو غزوہ بدر سے جوڑ تو دیا لیکن اس مخاصمت کو بھی بدر کے تمام مسلمانوں اور مشرکوں کی بجائے بنو ہاشم سے تعلق رکھنے والے تین صحابہؓ اور بنو امیہ سے تعلق رکھنے والے تین مشرکین سے ہی متعلق کردیا جو کہ عام مقابلے سے پہلے لڑے تھے. ابو مجلز کا زمانہ وہ دور تھا جب بنو امیہ اقتدار میں تھے اور بنو ہاشم کے علوی اور عباسی خاندان اقتدار حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے. ریاست کے خلاف لوگوں کی ذہن سازی کے لئے قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ سے منسوب سچے جھوٹے حوالے ایک بہترن ہتھیار ثابت ہو سکتے تھے. سوچنے کی بات ہے کہ اگر یہ آیت بدر کے موقع پر ہی نازل ہوئی ہوتی تو کیا رسول اللہ ﷺ اس کے سب سے پہلے حقدار نہ ہوتے اور دوسری جانب ابو جہل جس کے ایما پر یہ ساری جنگ وقوع پذیر ہوئی تھی تو یہ روایت اس کی بھی کوئی مذمت نہیں کرتی.
بلکہ جن تین افراد کو چنا گیا وہ نہ صرف بنو امیہ کے افراد تھے بلکہ ان میں سے ایک حضرت امیر معاویہؓ کا نانا دوسرا ماموں اور تیسرا نانا کا بھائی تھا. شان نزول کی روایت تو صاف بتا رہی ہے کہ جس مذمت کا حقدار ابو جہل نہ ہو بلکہ اس ہی کی معیت میں لڑنے والے تین دیگر افراد ہوں تو اس کا مطلب ان تین افراد کا بنیادی جرم غزوہ بدر میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنا نہیں بلکہ حضرت امیر معاویہؓ کا رشتہ دار ہونا ہے. ابو مجلزنے یہ روایت ضرور کسی شیعہ سے سنی ہو گی اور مضطرب الحدیث ہونے کے ناطے قیس بن عباد کے سر منڈھ دی. بعد میں جب یہ صحیحین کی زینت بن گئی تو گویا اب ہمارے ایمانیات کا حصہ بن گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون

حاصل کلام:

سورہ الحج کی ان آیات کا آج کے مسلم معاشرے سے پورا پورا تعلق ہے، کیونکہ ہماری اکثریت بھی اس وقت بالکل اسی ڈگر پر پہنچ چکی ہے کہ جس وقت بعثت نبوی ﷺ کے زمانے کا دنیاوی معاشرہ تھا۔ ہماری عوام کی اکثریت تو قران کو عرصہ دراز ہوا خود ہی تیاگ چکی ہے، اور جب ہدایت کا اصل منبع ہاتھوں سے نکل جائے، تو وہی صورت حال پیش آتی ہے کہ جو آیت ۳ میں پیش کی گئی ہے کہ ہر شیطان کی پیروی کرنے لگتے ہیں- دوسرا گروہ وہ ہے کہ جو بالعموم دانشوران پر مشتمل ہے، دنیا جہان کے نظریات کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اور یہ نظریات محض دینی نہیں ہوتے بلکہ سماجی، سیاسی ، معاشی ثقافتی، ہر پہلو سے متعلق ہیں۔ جب ایک طبقہ معاشرے میں

علمی و ذہنی سطح پر باقی افراد سے اوپر ہوتا ہے، تو اسکی ذمہ داری بھی دوچند ہوتی ہے۔ اللہ تعالی نے قران کو فرقان قرار دیا ہے، تو یہ فرقان دنیا کے ہر اس عکم سے متعلق ہے کہ جس سے ہمارا معاشرہ اثر انداز ہوتا ہے۔ قران کے بتائے ہوئے اصولوں کے تابع رہتے ہوئے یہ طبقہ اپنا کام کرے تو بہترین کردار ادا کرسکتا ہے، اور اگر قران کو پس پشت ڈال کر اس کے مخالف نظریات کا پرچار کریگا، تو اسکا انجام بھی وہی ہوگا، جو اللہ نے آیت ۸ تا ۱۰ مین بیان کیا ہے۔ تیسرا گروہ وہ ہے کہ جس سے ہماری مذہبی عوام کا تعلق ہے خواہ کسی بھی مسلک سے تعلق رکھتے ہوں، جہاں تک مسلک کے مطابق دین سمجھ آتا ہے اسکو قبول کر لیتے ہیں، اور جونہی قران مروجہ اسی کے خلاف بات کر رہا ہوتا ہے، تو پھر ناسخ منسوخ کی بحثیں شروع کرکے قران کو معطل کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی طبقہ کے متعلق بیان ہوا ہے کہ پھر وہ ایسی چیزوں کو پوجتے ہیں کہ جو نہ فائدہ پہنچا سکتی ہیں، نہ نقصان مثلاً آستانے، چوکھٹیں، قبریں، یہاں تک کہ ایک طبقہ تو گھوڑوں تک کو پوج رہا ہوتا ہے۔ ان ہی میں سے ایک طبقہ وہ ہوتا ہے، کہ جب قران ان کے خلاف جارہا ہوتا ہے، تو اپنے علماء کو پکارتے ہیں، وہ قران کی ایسی تاویل کرکے بیان کردیتے ہین کہ مسلک بھی ہاتھ سے نہ جائے، اور خود پر بھی الزام نہ پڑے، ایسے طبقے کو کہا گیا ہے کہ ان کا نقصان ان کے فائدہ سے بہت زیادہ ہے۔اللہ سے دعا ہے کہ ہم کو اس طبقہ میں سے اٹھا کہ جس نے عمدہ قول یعنی قران مجید کی راہ پائی اور تعریف والے اللّٰہ کی راہ پاگئے

مزید سوچنے کی بات یہ ہے کہ آیت ۱۱ میں جو فرمایا جاتا ہے کہ لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کنارے پر عبادت کرتا ہے. آخر اس کا مطلب کیا ہوا؟ یہ کس چیز کے کنارے کی بات ہو رہی ہے؟ کہیں یہ تو نہیں کہا جا رہا ہے کہ دین سماجی، معاشرتی، معاشی اصولوں کا وہ  سمندر ہے جس میں اترنا ہے، جہاں حق اور مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہے، جہاں سچ اور رشتے آمنے سامنے ہوتے ہیں، جہاں لوگ کیا کہیں گے اور اللّٰہ کیا کہتا ہے کی تکرار ہوتی ہے اور عبادت تو انسان کو بس طاقت دیتی ہے اس سمندر میں اترنے کے لئے. لیکن ہم نے عبادت کو دین سمجھ لیا ہے اور اگر ہم دین میں آگے جانا چاہتے ہیں تو دنیا سے کٹ جاتے ہیں اور عبادت میں ہی بس مصروف رہتے ہیں، جب کہ اللّٰہ تو کہہ رہا ہے کہ اٹھو اور اس دنیا کو بدلو اور اس کے لئے کوشش اور جدوجہد کرو. اور اگر صرف عبادت میں ہی مصروف رہو گے تو تم صرف دین کے کنارے پر ہی کھڑے ہو.